نِظَامُ الاسلام

تقی الدین النبہانی

حزب التحریر

پہلا ایڈیشن: 1372ھ---1953ء

چھٹا ایڈیشن: 1422ھ---2001ء

(عربی سے ترجمہ: 1428ھ---2007ء)

فہرست

ایمان کا راستہ 5

قضاء وقدر 19

اسلام کی فکری قیادت 30

اسلامی دعوت کو پیش کرنے کی کیفیت 71

اسلامی تہذیب 79

اسلامی نظام 85

حکمِ شرعی 91

احکام شرعیہ کی اقسام 95

سُنّت 96

رسول اللہ ﷺ کے افعال کو بطور اسوۂ اختیار کرنا 97

احکام شرعیہ کی تبنی 99

مسودۂ دستور 107

عمومی احکامات 107

نظامِ حکومت 109

خلیفہ 111

معاونِ تفویض 118

معاونِ تنفیذ 120

والی (گورنرز) 121

امیرِ جہاد: شعبۂ حرب-افواج 123

شعبۂ داخلی امن وسلامتی 125
شعبۂ خارجہ 126
شعبۂ صنعت 126
عدلیہ 126
انتظامی ڈھانچہ 131
بیت المال 132
میڈیا 132
مجلس امت 133
معاشرتی نظام 136
اقتصادی نظام 138
تعلیمی پالیسی 148
خارجہ سیاست 151
اسلام میں اخلاق 154

بِسۡمِ ٱللَّهِ ٱلرَّحۡمَٰنِ ٱلرَّحِيمِ

ایمان کا راستہ

انسان اپنی اس فکر کی بنیاد پر نشاۃ ثانیہ (ترقی) حاصل کرتا ہے جو وہ حیات، کائنات اور بنی نوع انسان کے بارے میں، اور اس دنیاوی زندگی سے قبل اور بعد سے اِن تمام کے تعلق، کے بارے میں رکھتا ہے۔ چنانچہ ترقی (نشاۃ ثانیہ) کے لیے انسان کی موجودہ فکر میں جامع اور بنیادی تبدیلی لانا اور اس کی جگہ ایک دوسری فکر پیدا کرنا نہایت ضروری ہے۔ کیونکہ فکر ہی وہ چیز ہے جو اشیاء کے بارے میں تصورات پیدا کرتی ہے اور ان تصورات کو ایک مرکز پر جمع کرتی ہے۔ انسان زندگی کے بارے میں اپنے تصورات کے مطابق ہی اپنے رویے کو ڈھالتا ہے۔ پس اگر انسان ایک شخص کے متعلق محبت کے تصورات رکھتا ہے تو اس کے ساتھ ویسا ہی رویہ اختیار کرتا ہے۔ اسی طرح جس شخص کے بارے میں وہ نفرت کے تصورات رکھتا ہے، اس کے ساتھ سلوک بھی اُسی قسم کا کرتا ہے۔ اور جس شخص کو وہ نہیں جانتا اور اس کے بارے میں کوئی تصورات نہیں رکھتا تو انسان اس کے ساتھ اسی قسم کا رویہ رکھے گا۔ گویا انسان کا رویہ اس کے تصورات کے ساتھ منسلک ہے۔ پس اگر ہم انسان کے پست رویے کو تبدیل کر کے اسے بلند رویے والا بنانا چاہتے ہیں تو سب سے پہلے ہمیں اس کے تصورات کو تبدیل کرنا پڑے گا۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

(اِنَّ اللّٰهَ لَايُغَيِّرُ مَابِقَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوا مَابِاَنْفُسِهِمْ)

''اللہ تعالیٰ کسی قوم کی حالت کو اس وقت تک نہیں بدلتا جب تک وہ اس چیز کو نہ بدلیں جو ان کے اپنے نفوس میں ہے''

(الرعد:11)

تصورات کو بدلنے کا ایک ہی راستہ ہے اور وہ یہ ہے کہ دنیاوی زندگی کے بارے میں فکر پیدا کی جائے۔ تاکہ اس کے ذریعے دنیاوی زندگی کے بارے میں صحیح تصورات پیدا ہو جائیں۔ دنیاوی زندگی کے بارے میں فکر اس وقت تک نتیجہ خیز طور پر مرکوز نہیں ہو سکتی جب تک کائنات، انسان، حیات کے متعلق اور دنیاوی زندگی سے قبل اور بعد کے

ساتھ ان سب کے تعلق کے بارے میں فکر پیدا نہ ہو جائے۔ یہ فکر کائنات، انسان اور حیات سے ماوراء کے بارے میں ایک مکمل فکر دینے سے پیدا ہوتی ہے۔ کیونکہ یہی مکمل فکر وہ فکری بنیاد ہے جس پر زندگی کے بارے میں تمام افکار کی عمارت استوار ہے۔ ان اشیاء کے بارے میں مکمل نقطۂ نظر دینا ہی انسان کے سب سے بڑے سوال (یعنی عُقدَۃُالکُبریٰ) کا حل ہے۔ جس وقت یہ سوال حل ہو جائے، باقی سوال بھی حل ہو جائیں گے۔ کیونکہ باقی سوال یا تو اسی سوال کا جزو ہیں یا وہ اس کی فروعات ہیں۔ لیکن یہ حل اس وقت تک صحیح نشاۃِثانیہ تک نہیں پہنچا سکتا جب تک کہ یہ حل ایک صحیح حل نہ ہو، جو انسانی فطرت کے عین موافق ہو، عقل کو قائل کرے اور دل کو اطمینان بخشے۔

کائنات، انسان اور حیات کے بارے میں فکرِ مُستَنِیر (روشن فکر) کے بغیر اس صحیح حل تک پہنچنا ممکن نہیں۔ اس لیے نشاۃِثانیہ کی خواہش رکھنے والوں اور ترقی کی راہ پر چلنے والوں کو سب سے پہلے اس سوال کو روشن فکر کے ذریعے حل کرنا چاہیے۔ یہی حل ہی عقیدہ ہے اور یہی وہ فکری بنیاد ہے جس پر طرزِ زندگی اور زندگی کے نظاموں کے بارے میں ہر فروعی فکر کی عمارت استوار ہے۔

اسلام اس عُقدَۃُالکُبریٰ کی طرف متوجہ ہوا اور انسان کے سامنے اس مسئلے کا ایسا حل پیش کیا، جو فطرت کے عین موافق ہے، عقل کو قائل کرتا ہے اور دل کو اطمینان بخشتا ہے۔ اسلام نے اپنے اندر داخل ہونے کو اس حل کے عقلی اقرار پر موقوف کیا۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام ایک ہی اساس یعنی عقیدہ پر قائم ہے۔ وہ عقیدہ یہ ہے کہ اس کائنات، انسان اور حیات سے قبل ایک خالق موجود ہے، جس نے ان سب کو اور ہر شے کو پیدا کیا ہے۔ وہ خالق اللہ تعالیٰ ہے۔ وہ اشیاء کو عدم سے وجود میں لایا۔ اس کا وجود ایک لازمی امر ہے۔ وہ مخلوق نہیں ہے ورنہ وہ خالق نہ ہوتا۔ یہ امر کہ وہ خالق ہے اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ وہ غیر مخلوق ہو۔ یہ امر اس کے وجود کی لازمیت کا تقاضا بھی کرتا ہے کیونکہ تمام اشیاء اپنے وجود کے لیے اس کی محتاج ہیں اور وہ کسی کا محتاج نہیں ہے۔

جہاں تک اشیاء کے لیے ایک ایسے خالق کے وجود کی ضرورت کا تعلق ہے تو یہ اس لیے ہے کہ وہ تمام اشیاء جن کا عقل ادراک کرتی ہے مثلاً انسان، حیات اور کائنات؛ سب کی سب محدود، عاجز و ناقص اور محتاج ہیں۔ پس انسان محدود ہے کیونکہ وہ ہر چیز میں ایک حد تک جا سکتا ہے، اس سے تجاوز نہیں کر سکتا، لہٰذا وہ محدود ہے۔ زندگی بھی محدود ہے، کیونکہ اس کا مظہر ہی انفرادی ہے اور حواس کے ذریعے اس بات کا مشاہدہ کیا جاتا ہے کہ یہ ایک فرد کے اندر ہی ختم ہو جاتی ہے۔ لہٰذا یہ بھی محدود ہے۔ کائنات بھی محدود ہے کیونکہ یہ ایسے اجسام کا مجموعہ ہے، جن میں ہر جسم محدود ہے اور محدود اشیاء کا مجموعہ بھی لازمی طور پر محدود ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انسان، کائنات اور حیات سب کے سب قطعی طور پر محدود ہیں۔ جب ہم ایک محدود چیز پر غور کرتے ہیں تو ہم دیکھتے ہیں کہ وہ ازلی نہیں ہے۔ کیونکہ اگر وہ چیز ازلی ہوتی تو محدود نہ ہوتی۔ لہٰذا محدود چیز لازمی طور پر کسی اور کی مخلوق ہو گی اور وہ ذات ہی انسان، حیات اور کائنات کی خالق ہے۔ پھر یہ خالق یا تو کسی اور کی مخلوق ہو گا یا خود اپنا ہی خالق ہو گا یا پھر وہ ازلی ہو گا، جس کے وجود کا ہونا ایک لازمی امر ہو۔ اس کا کسی اور کی مخلوق ہونا تو باطل ہے، کیونکہ اس صورت میں وہ محدود ٹھہرے گا۔ نیز اپنے آپ کا خالق ہونا بھی باطل ہے کیونکہ اس صورت میں وہ ایک ہی وقت میں اپنا خالق اور اپنے آپ کی مخلوق ہو گا، اور یہ بھی باطل ہے۔ لہٰذا یہ خالق ازلی اور واجب الوجود ہی ہو سکتا ہے اور یہ خالق اللہ تعالیٰ ہے۔

انسان کے حواس جن اشیاء کو محسوس کرتے ہیں، محض ان اشیاء کے وجود سے ہی ایک صاحبِ عقل شخص اس بات کا ادراک کر سکتا ہے کہ ان کا کوئی خالق ہے۔ کیونکہ ان تمام اشیاء میں اس امر کا مشاہدہ کیا جا سکتا ہے کہ یہ ناقص و عاجز ہیں اور کسی ذات کی محتاج ہیں، لہٰذا یہ قطعی طور پر مخلوق ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس نتیجے تک پہنچنے کے لیے کہ خالقِ مدبر کی ذات موجود ہے؛ کائنات، انسان اور حیات میں سے کسی ایک کی طرف نگاہ ڈالنا ہی کافی ہے۔ پس کائنات میں موجود ستاروں میں سے کسی ایک ستارے پر نگاہ ڈالنا یا زندگی کی صورتوں میں سے کسی بھی صورت کے بارے میں غور و خوض کرنا، اور انسان کے کسی پہلو کا بھی ادراک کرنا اللہ تعالیٰ کے وجود کے حق میں قطعی دلیل ہے۔ چنانچہ ہم دیکھتے

ہیں کہ قرآنِ کریم ان اشیاء کی طرف توجہ دلاتا ہے اور انسان کو دعوت دیتا ہے کہ وہ اپنے ماحول اور اس سے متعلقہ امور پر نظر ڈالے اور دیکھے کہ کس طرح یہ اشیاء کسی ذات کی محتاج ہیں؛ اور اس کے نتیجے میں انسان ایک خالقِ مدبر کے وجود کا مکمل طور پر ادراک کرے۔ اس بارے میں سینکڑوں آیات وارد ہوئی ہیں۔ سورۃ اٰل عمٰرن میں ارشاد ہوتا ہے:

(اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوَاتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ اللَّیْلِ وَالنَّھَارِ لَاٰیَاتٍ لِّاُولِی الْاَلْبَابِ)

''بے شک آسمان اور زمین کے پیدا کرنے اور دن رات کے ادل بدل کر آنے جانے میں عقل والوں کے لیے نشانیاں ہیں''(آیت:190)

اور سورۃ روم میں ارشاد ہوا:

(وَمِنْ آیَاتِہٖ خَلْقُ السَّمَوَاتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافُ اَلْسِنَتِکُمْ وَاَلْوَانِکُمْ)

''اور اس کی نشانیوں میں سے آسمانوں اور زمین کی تخلیق ہے اور تمہاری زبانوں اور رنگوں کا مختلف ہونا''(آیت:22)

اور سورۃ الغاشیۃ میں ارشاد ہوا:

(اَفَلَایَنْظُرُوْنَ اِلَی الْاِبِلِ کَیْفَ خُلِقَتْ۔ وَاِلَی السَّمَآءِ کَیْفَ رُفِعَتْ۔ وَاِلَی الْجِبَالِ کَیْفَ نُصِبَتْ۔ وَاِلَی الْاَرْضِ کَیْفَ سُطِحَتْ)

''بھلا یہ نہیں دیکھتے کہ اونٹ کیسے پیدا کیا گیا؟ آسمانوں کو کیسے بلند کیا گیا؟ اور پہاڑ کیسے کھڑے کیے گئے؟ اور زمین کو کیسے ہموار کیا گیا؟''(آیت:17تا20)

سورۃ طارق میں ارشاد ہے:

(فَلْیَنْظُرِ الاِنْسَانُ مِمَّ خُلِقَ۔ خُلِقَ مِنْ مَّآءٍ دَافِقٍ۔ یَّخْرُجُ مِنْ بَیْنِ الصُّلْبِ وَالتَّرَآءِبِ)

''انسان کو سوچنا چاہیے کہ وہ کس چیز سے پیدا کیا گیا؟ انسان کی پیدائش اس اُچھلنے والے پانی سے ہوئی، جو چھاتی اور پسلیوں کے درمیان سے نکلتا ہے'' (آیت: 5تا7)

اور سورۃ البقرہ میں ارشاد ہے:

(اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوَاتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ اللَّیْلِ وَالنَّھَارِوَالْفُلْکِ الَّتِیْ تَجْرِیْ فِی الْبَحْرِ بِمَا یَنْفَعُ النَّاسَ وَمَااَنْزَلَ اللّٰہُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ مَّآءٍ فَاَحْیَا بِہِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِھَا وَبَثَّ فِیْھَا مِنْ کُلِّ دَآبَّۃٍ وَّتَصْرِیْفِ الرِّیَاحِ وَالسَّحَابِ الْمُسَخَّرِ بَیْنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ لَاٰیَاتٍ لِّقَوْمٍ یَّعْقِلُوْنَ)

''بے شک آسمانوں اور زمین کی پیدائش میں، رات دن کے ادل بدل کر آنے جانے میں، اور ان کشتیوں میں جو انسان کے نفع کے لیے سمندروں میں دوڑتی پھرتی ہیں، اور اس بارش کے پانی میں جسے اللہ تعالیٰ نازل کرتا ہے کہ جس سے زمین مردہ (بنجر) ہونے کے بعد نئی زندگی حاصل کرتی ہے، جس کی وجہ سے چوپائے زمین پر پھیلے ہوئے ہیں، اور ہواؤں کے ہیر پھیر میں اور بادلوں کے آسمان اور زمین کے درمیان مسخر رہنے میں عقل والوں کے لیے نشانیاں ہیں'' (آیت: 164)

ان آیات کے علاوہ دیگر کئی آیات میں انسان کو اشیاء، ان کے گرد و نواح اور ان سے متعلقہ امور پر گہری نظر ڈالنے کی دعوت دی گئی ہے، جن سے انسان خالقِ مدبر کے وجود پر استدلال کر سکتا ہے۔ تاکہ اللہ تعالیٰ پر انسان کا ایمان پختہ اور عقلی ہو نیز یہ ایمان دلیل پر مبنی ہو۔

جی ہاں! اگرچہ خالق پر ایمان لانا ہر انسان کے اندر ایک قدرتی چیز ہے، مگر وِجدان انسان کو اس ایمان تک پہنچاتا ہے۔ تاہم صرف وِجدانی طریقہ سے حاصل ہونے والا نتیجہ قابلِ اعتبار نہیں ہوتا اور نہ ہی یہ نتیجہ پائیدار ہوتا ہے۔ وِجدان اکثر اوقات ایسی اشیاء کو ایمان میں شامل کرنے کا باعث بن جاتا ہے جن کا حقیقت میں کوئی وجود نہیں ہوتا۔ لیکن

اس کے باوجود وجدان انہیں ایمان لانے کے لیے لازمی خیال کرتا ہے۔ یوں انسان کفر یا گمراہی میں جا گرتا ہے۔ بت پرستی، توہمات اور خرافات وجدان ہی کی غلطی کا نتیجہ ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام نے صرف وجدان کو ایمان لانے کا طریقہ قرار نہیں دیا، کہ کہیں انسان اللہ تعالیٰ کے لیے ایسی صفات نہ مقرر کرلے جو شانِ معبودیت کے متناقض ہوں۔ یا کہیں اللہ کو مادی اشیاء میں مجسم نہ سمجھ بیٹھے یا کہیں مادی اشیاء کی عبادت سے اللہ تعالیٰ کے تقرب کو ممکن نہ سمجھنے لگے، جس کے نتیجے میں وہ کفر یا شرک کر بیٹھے یا ایسے توہمات اور خرافات میں پھنس جائے جو ایمانِ صادق کے منافی ہیں۔ اس لیے اسلام نے وِجدان کے ساتھ عقل کے استعمال کو لازمی قرار دیا ہے، اور اللہ تعالیٰ پر ایمان لانے کے لیے عقل کے استعمال کو ضروری کر دیا ہے، اور اللہ تعالیٰ پر ایمان لانے کے لیے صرف عقل کو فیصلہ کن قرار دیا ہے اور عقیدہ میں تقلید سے منع فرمایا ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

(اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ اللَّیْلِ وَالنَّهَارِ لَاٰیاتٍ لِّاُولِی الْاَلْبَابِ)

''بے شک آسمانوں اور زمین کی پیدائش میں اور دن رات کے ادل بدل کر آنے جانے میں عقل والوں کے لیے نشانیاں ہیں''(اٰل عمٰرن:190)

اس لیے ہر مسلمان کا ایمان لازمی طور پر غور و فکر اور بحث و نظر کی بنیاد پر ہونا چاہیے۔ اللہ تعالیٰ پر ایمان لانے میں صرف عقل کو فیصلہ کن ٹھہرانا چاہیے۔ قرآن مجید کی کئی سورتوں میں ایسی سینکڑوں آیات ہیں، جو اللہ تعالیٰ کے قوانین کا مشاہدہ کرنے اور اللہ تعالیٰ پر ایمان لانے کے لیے راہنمائی حاصل کرنے کی خاطر کائنات میں غور و فکر کرنے کی دعوت دیتی ہیں۔ یہ سب کی سب آیات انسان کو گہری سوچ بچار اور غور و خوض کی دعوت دیتی ہیں۔ تاکہ اس کا ایمان عقل اور دلیل پر مبنی ہو۔ یہ آیات انسان کو ڈراتی ہیں کہ وہ اپنے باپ دادا کے عقائد اور اعمال کو غور و فکر، تحقیق و جائزہ، اور ان کے درست ہونے کے متعلق خود یقین حاصل کیے بغیر قبول نہ کرے۔ یہ ہے وہ ایمان جس کی اسلام دعوت دیتا ہے۔ یہ وہ ایمان نہیں جس کو 'ایمانُ العجائز' یعنی بوڑھوں کا ایمان کہتے ہیں۔ بلکہ یہ اُس روشن فکر رکھنے والے

صاحبِ یقین شخص کا ایمان ہے جو فکر و نظر سے کام لیتا ہے اور غور و خوض کرتا ہے۔ پھر اسی فکر و نظر اور بحث و تفکیر کے ذریعے وہ اس اللہ تعالیٰ پر ایمان و یقین تک پہنچتا ہے، جو بے پناہ قدرت کا مالک ہے۔

اگرچہ اللہ پر ایمان تک پہنچنے کے لیے عقل کا استعمال انسان پر فرض ہے لیکن انسان کے لیے اللہ کی ذات کا احاطہ کرنا ممکن نہیں، جو انسان کے حواس اور عقل سے بالاتر ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انسان کی عقل محدود ہے۔ اور ایک محدود قوت خواہ کتنی ہی اعلیٰ ہو جائے اور اس کی صلاحیت میں کتنا ہی اضافہ ہو جائے، وہ محدود ہی رہتی ہے اور اپنی حد سے آگے نہیں بڑھ سکتی۔ چنانچہ انسان کی ادراک کرنے کی صلاحیت محدود ہے۔ معلوم ہوا کہ انسان اللہ تعالیٰ کی ذات کے ادراک سے قاصر ہے اور اللہ تعالیٰ کی حقیقت کے ادراک سے بھی عاجز ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کائنات، انسان او رحیات سے ماوراء ہے اور انسانی عقل کسی ایسی چیز کا ادراک نہیں کر سکتی جو اس سے ماوراء ہو۔ اس لیے وہ اللہ تعالیٰ کی ذات کے ادراک سے عاجز ہے۔ تاہم یہاں پر یہ نہیں کہا جا سکتا کہ ''اگر انسان کی عقل اللہ تعالیٰ کی ذات کے ادراک سے عاجز ہے، تو پھر انسان اللہ پر عقلی طور پر ایمان کیسے لائے؟'' کیونکہ اللہ تعالیٰ پر ایمان لانے کا مطلب ہے کہ اللہ تعالیٰ کے وجود پر ایمان لانا، اور اللہ تعالیٰ کے وجود کا ادراک اس کی مخلوقات کے وجود کے ادراک کے ذریعے ہوتا ہے۔ اور اس کی مخلوقات کائنات، انسان اور حیات ہیں، اور ان مخلوقات کا ادراک عقل کے دائرے میں ہے۔ اس لیے عقل نے ان سب کا ادراک کیا اور ان کے ادراک کے نتیجے میں خالق کی موجودگی کا بھی ادراک کیا اور وہ خالق اللہ تعالیٰ ہے۔ چنانچہ اللہ کے وجود پر ایمان عقلی ہے اور عقل کے دائرے کے اندر ہے۔ اس کے برخلاف، اللہ تعالیٰ کی ذات کا ادراک ناممکن ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کی ذات کائنات، انسان اور حیات سے ماوراء ہے۔ لہٰذا وہ عقل کی پہنچ سے بھی ماوراء ہے۔ عقل کے لیے یہ ممکن نہیں کہ وہ اپنے سے ماوراء کسی چیز کا ادراک کر سکے۔ عقل کی یہ عاجزی یعنی اپنے سے ماوراء کا ادراک نہ کر سکنا ایمان کو مضبوط کرتی ہے اور یہ کسی قسم کے شک و شبے کا باعث نہیں بنتی۔ کیونکہ جب اللہ پر ہمارا ایمان عقل کے ذریعے ہے تو اس کے وجود کا ادراک بھی کامل ہوگا۔ جب اللہ تعالیٰ کے وجود کے بارے میں ہمارا شعور عقلی ہو تو اللہ تعالیٰ

کے وجود کے بارے میں ہمارا یہ شعور ایک یقینی شعور ہو گا۔ اس سے ہمیں ایک مکمل ادراک اور خالق کی تمام تر صفات کے حوالے سے یقینی شعور حاصل ہوتا ہے۔ جس سے ہمیں یہ یقین ہوتا ہے کہ ہم اللہ پر مضبوط ایمان رکھنے کے باوجود اللہ تعالیٰ کی حقیقت کے ادراک کی ہر گز طاقت نہیں رکھتے۔ پس ہم پر لازم ہے کہ ہم اُس تمام کو تسلیم کریں جس کی اللہ نے ہمیں خبر دی ہے، اور جس کے ادراک کرنے یا اس کے ادراک تک پہنچنے سے ہماری عقل قاصر ہے، اور یہ انسانی عقل کی فطری عاجزی کی وجہ سے ہے جو اپنے محدود اور نسبتی پیمانوں کے ذریعے، اپنے سے ماوراء کا ادراک نہیں کر سکتی۔ کیونکہ اللہ کے ادراک کے لیے ایسے پیمانوں کی ضرورت ہے، جو نہ تو نسبتی ہوں اور نہ ہی محدود ہوں۔ اور یہ ایک ایسی چیز ہے، جس کا نہ تو انسان مالک ہے اور نہ ہی وہ کبھی اس کا مالک بن سکتا ہے۔

اب رہی رسولوں کی ضرورت کے ثبوت کی بات! تو یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ کی مخلوق ہے اور تَدَیُّن انسان کے اندر ایک فطری چیز ہے۔ کیونکہ یہ انسان میں پائی جانے والی جبِلّتوں میں سے ایک جبِلّت ہے۔ انسان فطری طور پر اپنے خالق کی تقدیس کرتا ہے اور یہی تقدیس عبادت ہے۔ یہی انسان اور خالق کے درمیان تعلق ہے۔ اگر اس تعلق کو کسی نظام کے بغیر چھوڑ دیا جائے تو یہ پریشانی (پراگندگی) اور غیر خالق کی عبادت کی طرف لے جائے گا۔ چنانچہ لازم ہے کہ یہ تعلق ایک صحیح نظام کے ذریعے منظم ہو۔ یہ نظام کوئی انسان نہیں بنا سکتا۔ کیونکہ وہ خالق کی حقیقت کا ادراک ہی نہیں کر سکتا تو اس کے ساتھ تعلق کے لیے نظام کس طرح بنائے گا؟ لہٰذا یہ نظام خالق ہی بنا سکتا ہے۔ اور ضروری ہے کہ خالق اس نظام کو انسانوں تک پہنچائے؟ پس اللہ کے دین (نظام) کو لوگوں تک پہنچانے کے لیے رسولوں کی ضرورت ہے۔

انسانوں کے لیے رسولوں کی ضرورت کی دلیل یہ بھی ہے کہ اپنی جبلتوں اور جسمانی حاجات کو پورا کرنا انسان کی ضرورت ہے۔ اگر ان جبلتوں اور جسمانی حاجات کا پورا کرنا کسی نظام کے بغیر ہو، تو یہ غلط اور خلافِ معمول ہونے کی وجہ سے انسان کی بد بختی کا سبب بن جائے گا۔ لہٰذا ایک ایسے نظام کی ضرورت ہے، جو انسان کی جبلتوں

اور جسمانی حاجات کو منظم انداز سے پورا کرے۔ یہ نظام انسان نہیں بنا سکتا۔ کیونکہ انسانی جبلتوں اور جسمانی حاجات کو منظم کرنے کے بارے میں اس کا فہم تفاوت، اختلاف اور تضاد سے دوچار ہوتا رہتا ہے۔ اسی طرح وہ اس ماحول سے بھی متاثر ہوتا ہے، جس میں وہ رہ رہا ہو۔ پس اگر نظام کا بنانا انسان پر چھوڑ دیا جائے تو اس نظام میں تفاوت، اختلاف اور تضاد ہو گا اور یہ انسان کی بد بختی کا سبب بن جائے گا۔ چنانچہ نظام اللہ تعالیٰ ہی کی طرف سے ہو سکتا ہے۔

اور جہاں تک قرآن کا اللہ کی کتاب ہونے کے ثبوت کا تعلق ہے، تو بات یہ ہے کہ قرآن ایک کتاب ہے جو عربی زبان میں ہے اور جسے محمد لے کر آئے۔ لہٰذا یا تو یہ کتاب اہلِ عرب کی طرف سے ہو گی یا محمد کی جانب سے، یا پھر اللہ تعالیٰ کی طرف سے۔ ان تینوں کے علاوہ یہ کسی اور کی طرف سے نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ اس کی زبان بھی عربی ہے او راسلوب بھی۔

اب جہاں تک قرآن کے اہلِ عرب کی جانب سے ہونے کا تعلق ہے تو یہ باطل ہے۔ کیونکہ قرآن نے عرب کو چیلنج کیا کہ وہ اس جیسی کتاب لا کر دکھائیں۔ ارشاد ہوا:

(قُلْ فَأْتُوا بِعَشْرِ سُوَرٍ مِّثْلِهٖ)

''آپ کہہ دیجیے کہ اس جیسی دس سورتیں لے آؤ''(ھود: 13)

(قُلْ فَأْتُوا بِسُوْرَةٍ مِّثْلِهٖ)

''آپ کہہ دیجیے کہ اس جیسی ایک سورت ہی لے آؤ''(یونس: 38)

اہلِ عرب نے اس جیسا کلام لانے کی سر توڑ کوشش کی، لیکن ناکام ہوئے۔ معلوم ہوا کہ یہ عربوں کا کلام نہیں، ورنہ وہ اس جیسا کلام لانے سے عاجز نہ ہوتے اور نہ ہی اس چیلنج کا جواب دینے میں ناکام ہوتے۔ یہ کہنا کہ قرآن محمد کی بنائی ہوئی کتاب ہے، تو یہ بھی باطل ہے۔ کیونکہ محمد بھی ایک عربی تھے اور ایک شخص خواہ کتنا ہی ذہین و فطین

کیوں نہ ہو وہ ایک انسان اور اپنے معاشرے اور قوم کا ایک فرد ہی ہوتا ہے۔ چنانچہ جب عرب قرآن کی طرح کا کلام نہیں لا سکے تو یہ بات محمد عربی اپر بھی صادق آتی ہے کہ آپ ابھی اس کا مثل نہیں لا سکتے۔ لہٰذا قرآن محمد اکی جانب سے بھی نہیں۔ علاوہ ازیں محمد اکی صحیح احادیث بھی موجود ہیں، جو متواتر روایات کے ذریعے ہم تک پہنچی ہیں، اور جو یقیناً سچی ہیں۔ جب کسی بھی حدیث کا کسی آیت سے موازنہ کیا جائے اور دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ دونوں کے اسلوب میں کوئی مشابہت نہیں۔ حالانکہ آپ اجس وقت نازل ہونے والی آیات کی تلاوت فرمایا کرتے تھے، اسی وقت آپ یہ احادیث بھی بیان فرمایا کرتے تھے۔ پھر بھی ان دونوں کے اسلوب میں واضح فرق ہے۔ انسان کے کلام میں خواہ کتنا ہیتنوّعکیوں نہ ہو، اس میں اسلوب کی مشابہت ضرور ہوتی ہے۔اور قرآن و حدیث میں اسلوب کی مشابہت بالکل نہیں۔ تو معلوم ہوا کہ قرآن محمد اکا کلام ہر گز نہیں۔ کیونکہ دونوں کے درمیان واضح اور صریح فرق ہے۔ باوجود یہ کہ اہلِ عرب عربی کلام کے اسالیب کے ماہر تھے، لیکن انہوں نے کبھی یہ دعویٰ نہیں کیا کہ قرآن محمد اکا کلام ہے یا آپ اکی گفتگو سے مشابہت رکھتا ہے۔ البتہ انہوں نے یہ دعویٰ ضرور کیا کہ محمد ا یہ قرآن ایک نصرانی غلام جبَر سے سیکھ کر تیار کرتا ہے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے ان کے اس دعوے کو رد کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:

(وَلَقَدْ نَعْلَمُ اَنَّهُمْ يَقُوْلُوْنَ اِنَّمَايُعَلِّمُه بَشَرٌ لِسَانُ الَّذِیْ يُلْحِدُوْنَ اِلَيْهِ اَعْجَمِیٌّ وَّهٰذَالِسَانٌ عَرَبِیٌّ مُّبِيْنٌ)

"اور بے شک ہم جانتے ہیں کہ وہ کہتے ہیں کہ اسے ایک انسان قرآن سکھاتا ہے۔اس شخص کی زبان، جس کی طرف یہ اس قرآن کو منسوب کرتے ہیں، عجمی ہے۔ حالانکہ یہ قرآن ایک صاف اور واضح عربی زبان میں ہے" (النحل:103)

جب یہ ثابت ہو گیا کہ قرآن نہ تو اہلِ عرب کا کلام ہے اور نہ محمد اکا کلام ہے، تو یہ یقیناً اللہ کا کلام ہے، اور جو اِسے لے کر آیا، یہ اُس کے حق میں ایک معجزہ ہے۔

چونکہ محمدا اسے لے کر آئے اور یہ قرآن اللہ کا کلام اور اللہ کی شریعت ہے اور اللہ کی شریعت کو کوئی نبی اور رسول ہی لے کر آتا ہے، تو قطعی طور پر اور عقلی دلیل کے ذریعے معلوم ہوا کہ محمداللہ کے رسول ہیں۔

یہ ہے اللہ تعالیٰ پر ایمان، محمدا کی رسالت اور قرآن کے کلام اللہ ہونے کی عقلی دلیل۔

لہٰذا معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ پر ایمان عقل کے ذریعے ہونا چاہیے اور ضروری ہے کہ یہ ایمان عقلی ہو۔ کیونکہ یہی وہ بنیاد ہے، جس پر تمام تر غیبی امور پر ایمان قائم ہے اور ہر اُس چیز پر ایمان قائم ہے جس کی اللہ تعالیٰ نے خبر دی ہے۔ جب ہم اللہ تعالیٰ اور اس کی صفاتِ معبودیت پر ایمان لائے ہیں، تو لازمی طور پر ہمیں اُن چیزوں پر بھی ایمان لانا چاہیے، جن کی اللہ تعالیٰ نے ہمیں خبر دی ہے۔ خواہ عقل ان کا ادراک کر سکتی ہو یا یہ عقل سے ماوراء ہوں۔ کیونکہ ان کے بارے میں اللہ ہی نے خبر دی ہے۔ اس لیے ان چیزوں پر ایمان لانا بھی فرض ہے، جن کا ذکر قرآن یا احادیثِ متواتر میں ہے۔ جیسا کہ قیامت کا دن، جنت، جہنم، عذاب، فرشتے، جن، شیاطین، حساب و کتاب وغیرہ۔ یہ ایمان اگرچہ نقلی اور سمعی طریقے پر ہے، لیکن دراصل یہ عقلی ایمان ہے۔ کیونکہ اس کی بنیاد کو عقلی طور پر ثابت کیا جا چکا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر مسلمان کا عقیدہ عقل کی بنیاد پر یا اُس چیز کی بنیاد پر ہونا چاہیے، جس کی اساس عقل پر ہو۔ پس مسلمان کو چاہئے کہ وہ ہر اُس چیز پر اعتقاد رکھے، جو عقل کے ذریعے یا قطعی اور یقینی سماعت کے ذریعے ثابت ہو۔ دوسرے لفظوں میں وہ چیز قرآن یا حدیثِ متواتر (قطعی احادیث) سے ثابت ہو۔ جو چیز ان دونوں (قرآن و سنتِ قطعی) سے ثابت نہ ہو، اس پر اعتقاد رکھنا حرام ہے۔ کیونکہ عقیدہ کی دلیل قطعی ہی ہو سکتی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ زندگی سے قبل یعنی اللہ تعالیٰ اور زندگی کے بعد یعنی قیامت پر ایمان لانا فرض ہے۔ تخلیق کے تعلق کے علاوہ اللہ تعالیٰ کے اوامر و نواہی قبل از حیات کا اس زندگی کے ساتھ تعلق قائم کرتے ہیں۔ اور انسان کے دنیا میں کیے گئے اعمال کے محاسبے سے حیاتِ دنیا کا دنیاوی زندگی کے بعد کے ساتھ تعلق قائم ہوتا ہے، یعنی اس دنیاوی زندگی کا قیامت سے تعلق قائم ہوتا ہے۔ کیونکہ یہ یقینی بات ہے کہ اس موجودہ زندگی کا اپنے سے قبل اور بعد کے ساتھ

تعلق ہے۔اور ضروری ہے کہ اس زندگی میں انسان کے اعمال اس تعلق میں مقید ہوں۔ پس انسان زندگی میں اللہ تعالیٰ کے نظاموں کے مطابق چلے اور یہ اعتقاد رکھے کہ قیامت کے دن اس سے دنیاوی اعمال کے متعلق باز پُرس ہو گی۔

اس بحث سے کائنات، حیات اور انسان سے ماوراء کے بارے میں روشن فکر (فکرِ مُستنیر) پیدا ہو گئی اور اسی طرح زندگی سے قبل اور بعد کے بارے میں اور اس دنیاوی زندگی کے اپنے سے قبل اور بعد کے ساتھ تعلق، کے بارے میں روشن فکر پیدا ہو گئی۔اور یوں ''العُقدۃ الکُبریٰ'' اسلام کے عقیدے کے ذریعے جامع طور پر حل ہو گیا۔

جب انسان اس حل تک پہنچ جاتا ہے، تب وہ دنیاوی زندگی کے بارے میں فکر کی طرف متوجہ ہو سکتا ہے۔ تاکہ اس کے نتیجے میں وہ سچے اور نتیجہ خیز تصورات تک پہنچے۔ معلوم ہوا کہ یہی حل وہ بنیاد ہے، جس پر وہ آئیڈیالوجی (مبدأ) قائم ہے، جسے نَہضَہ (نشاۃ ثانیہ) کے طور پر اختیار کیا جاتا ہے۔ اور یہی وہ بنیاد ہے، جس پر اس آئیڈیالوجی کی تہذیب قائم ہے۔ یہی وہ اساس ہے، جس سے اس کے نظام پھوٹتے ہیں اور یہی وہ اساس ہے، جس پر ریاست کی بنیاد استوار ہے۔ پس معلوم ہوا کہ جس اساس پر اسلام کی عمارت قائم ہے، وہ فکر اور طریقہ دونوں کے لحاظ سے یہی اسلامی عقیدہ ہے۔

(يَاأَيُّهَاالَّذِيْنَ آمَنُوآمِنُوا بِاللهِ وَرَسُولِهٖ وَالْكِتَابِ الَّذِى نَزَّلَ عَلٰى رَسُوْلِهٖ وَالْكِتَابِ الَّذِىْ اَنْزَلَ مِنْ قَبْلُ وَمَنْ يَّكْفُرْ بِاللهِ وَمَلَاءِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلَالًا بَعِيْدًا)

''اے ایمان والو! ایمان لاؤ اللہ تعالیٰ پر، اس کے رسولوں پر، اس کی کتاب پر، جو اس نے اپنے اِس رسول پر نازل فرمائی ہے اور اُن کتابوں پر، جنہیں اللہ تعالیٰ نے اس سے پہلے نازل فرمایا ہے۔اور جو کوئی انکار کرے گا اللہ تعالیٰ، اس کے ملائکہ، اس کی کتابوں، اس کے رسولوں اور آخرت کے دن کا، تو وہ بہت دور کی گمراہی میں مبتلا ہو جائے گا۔''(النساء:136)

یہ بات توثابت ہو چکی ہے کہ اسلام کی آئیڈیالوجی پر ایمان ایک حتمی چیز ہے، لہٰذا لازم ہے کہ مسلمان پوری شریعت پر مکمل ایمان لائے کیونکہ یہ شریعت قرآنِ کریم میں ہے اور اسے رسول اللہ ﷺ لے کر آئے ہیں۔ ورنہ انسان کافر ہو گا۔ لہٰذا شرعی احکام کا انکار یا قطعی طور پر ثابت کسی بھی تفصیلی حکم کا انکار کفر ہے، خواہ ان احکامات کا تعلق عبادات سے ہو یا معاملات سے، عقوبات سے ہو یا مطعومات سے۔ پس جس طرح اس آیت کا انکار کفر ہے:

(وَاَقِيْمُوا الصَّلَاةَ)

''اور نماز قائم کرو'' (البقرہ: 43)

بالکل اسی طرح اس آیت کا انکار بھی کفر ہے:

(اَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰوا)

''اللہ نے تجارت کو حلال کر دیا ہے اور سود کو حرام کر دیا ہے'' (البقرہ: 275)

اور جس طرح اس آیت کا انکار کفر ہے کہ:

(اَلسَّارِقُ وَالسَّارِقَةُ فَاقْطَعُوْا اَيْدِيَهُمَا)

''چور خواہ مرد ہو یا عورت، دونوں کے ہاتھ کاٹ دو'' (المائدۃ: 38)

اسی طرح اس آیت کا انکار بھی کفر ہے:

(حُرِّمَتْ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةُ وَالدَّمُ وَلَحْمُ الْخِنْزِيرِ وَمَا اُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ بِهٖ)

''تم پر مردار، خون، خنزیر کا گوشت اور غیر اللہ کے نام کا ذبیحہ حرام کر دیا گیا ہے'' (المائدۃ: 3)

اور شریعت پر ایمان عقل پر موقوف نہیں۔ بلکہ اللہ تعالیٰ کے ہر حکم کو کسی شش و پنج کے بغیر ماننا چاہیے:

(فَلاوَرَبِّکَ لَایُؤمِنُوْنَ حَتّٰی یُحَکِّمُوکَ فِیْمَا شَجَرَ بَیْنَھُمْ ثُمَّ لَایَجِدُوْا فِیْ اَنْفُسِھِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَیْتَ وَیُسَلِّمُوْا تَسْلِیْمًا)

''(اے محمدا) آپ کے رب کی قسم! یہ اس وقت تک مؤمن نہیں ہو سکتے جب تک کہ یہ آپ کو اپنے اختلافات میں فیصلہ کرنے والا نہ بنالیں۔ پھر جب آپ فیصلہ کریں تو یہ اپنے اندر کوئی گرانی محسوس نہ کریں۔ بلکہ ان فیصلوں کے سامنے سرنگوں ہو جائیں۔''(النساء: 65)

قضاءوقدر

سورۂ آلِ عمران میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

(وَمَاكَانَ لِنَفْسٍ اَنْ تَمُوْتَ اِلَّابِاِذْنِ اللّٰهِ كِتَابًا مُّؤَجَّلاً)

''کوئی جاندار اللہ کے حکم کے بغیر نہیں مرتا اور اس کی موت کا وقت لکھا ہوا (مقرر کیا ہوا) ہوتا ہے''(آیت:145)

سورۃ الاعراف میں ارشاد ہے:

(وَلِكُلِّ اُمَّةٍ اَجَلٌ فَاِذَا جَآءَ اَجَلُهُمْ لَايَسْتَأْخِرُوْنَ سَاعَةً وَّلَايَسْتَقْدِمُوْنَ)

''ہر امت کے لیے ایک اجل (مقررہ وقت) ہے، پس جب ان کی اجل آجاتی ہے تو وہ اس سے ایک گھڑی بھی آگے پیچھے نہیں ہو سکتے''(آیت:34)

سورۃ الحدید میں ارشاد ہے:

(مَااَصَابَ مِنْ مُّصِيْبَةٍ فِيْ الاَرْضِ وَلَافِيْ اَنْفُسِكُمْ اِلَّا فِيْ كِتَابٍ مِّنْ قَبْلِ اَنْ نَّبْرَاَهَا اِنَّ ذَالِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرٌ)

''جو بھی آفت پڑتی ہے زمین میں یا تمہاری جانوں میں، ہم نے اسے پیدا کرنے سے پہلے ہی کتاب میں لکھ دیا ہے، یقیناً یہ اللہ کے لیے آسان ہے''(آیت:22)

اور سورۃ التوبۃ میں ارشاد ہے:

(قُلْ لَّنْ يُّصِيْبَنَا اِلَّامَاكَتَبَ اللّٰهُ لَنَا هُوَ مَوْلَانَا وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ)

''کہہ دیجیے کہ ہم پر کوئی مصیبت نہیں آتی، مگر وہ جو اللہ تعالیٰ نے ہمارے لیے لکھ دی ہو، بے شک وہ (اللہ) ہمارا نگہبان ہے، اور مؤمنوں کو اسی پر بھروسہ کرنا چاہیے''(آیت:51)

اور سورۃ سبا میں ارشاد ہے:

(لَایَعْزُبُ عَنْهُ مِثْقَالُ ذَرَّةٍ فِیْ السَّمٰوَاتِ وَلَافِیْ الاَرْضِ وَلَااَصْغَرُ مِنْذَالِکَ وَلَااَکْبَرُ اِلَّا فِیْ کِتَابٍ مُّبِیْنٍ)

''اللہ سے کوئی ذرہ برابر چیز بھی پوشیدہ نہیں، خواہ وہ آسمانوں میں ہو یا زمین میں، اور نہ اس (ذرے) سے بھی کوئی چھوٹی یا بڑی چیز ہے، جو کتابِ مبین میں نہ ہو''(آیت: 3)

اور سورۃ الانعام میں ارشاد ہے:

(وَهُوَ الَّذِیْ یَتَوَفّٰکُمْ بِاللَّیْلِ وَیَعْلَمُ مَاجَرَحْتُمْ بِالنَّهَارِ ثُمَّ یَبْعَثُکُمْ فِیْهِ لِیُقْضٰی اَجَلٌ مُّسَمًّی ثُمَّ اِلَیْهِ مَرْجِعُکُمْ ثُمَّ یُنَبِّءُکُمْ بِمَاکُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ)

''اللہ تو وہ ہے جو رات کو تمہیں موت دیتا ہے، اور جانتا ہے جو کچھ دن میں تم کر چکے ہو۔ پھر تمہیں جگا دیتا ہے تاکہ معیادِ معین مکمل کر دی جائے۔ پھر اسی کی طرف تم لوٹائے جاؤ گے۔ پھر وہ تمہیں اس چیز کی خبر دے گا، جو کچھ تم کرتے رہے ہو''(آیت: 60)

اور سورۃ النساء میں ارشاد ہے:

(وَاِنْ تُصِبْهُمْ حَسَنَةٌ یَّقُوْلُوْا هٰذِهٖ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ وَاِنْ تُصِبْهُمْ سَیِّءَةٌ یَّقُوْلُوْا هٰذِهٖ مِنْ عِنْدِکَ قُلْ کُلٌّ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ فَمَا لِهٰؤُلَآءِ الْقَوْمِ لَایَکَادُوْنَ یَفْقَهُوْنَ حَدِیْثًا)

''اور اگر انہیں کوئی بھلائی پہنچے تو وہ کہتے ہیں کہ یہ اللہ کی طرف سے ہے اور اگر کوئی برائی پہنچے تو کہتے ہیں کہ یہ تیری طرف سے ہے۔ کہہ دیجیے کہ سب کچھ اللہ کی طرف سے ہے۔ سو ان لوگوں کا کیا حال ہے کہ بات کو سمجھنے والے بھی نہیں لگتے۔''(آیت: 78)

یہ اور اِن جیسی دوسری آیات سے بہت سے لوگ قضاء وقدر کے مسئلے کے بارے میں ایسے استدلال کرتے ہیں جن سے گمان ہوتا ہے کہ انسان اعمال کی انجام دہی میں محض مجبور ہے اور اللہ تعالیٰ کے ارادے اور مشیّت کے تحت انسان اعمال کی انجام دہی پر مجبور ہوتا ہے اور اللہ ہی انسان اور اس کے اعمال کا خالق ہے۔ اپنے اس قول کی تائید میں وہ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کو پیش کرتے ہیں:

(وَاللّٰهُ خَلَقَكُمْ وَمَاتَعْمَلُوْنَ)

''اللہ تعالیٰ نے تمہیں پیدا کیا اور تمہارے اعمال کو بھی'' (الصّٰفّٰت:96)

اسی طرح وہ بعض احادیث سے بھی استدلال کرتے ہیں، جیسا کہ رسول اللہ ﷺ کا یہ قول ہے:

((نَفَثَ رُوْحُ الْقُدُسِ فِيْ رُوْعِيْ لَنْ تَمُوْتَ نَفْسٌ حَتّٰى تَسْتَوْفِيْ رِزْقَهَا وَاَجَلَهَا وَمَاقُدِرَ لَهَا))

''روح القدس نے یہ بات میرے دل میں ڈال دی کہ کوئی ذی روح اس وقت تک نہیں مر سکتا، جب تک کہ وہ اپنے رزق، اپنی اَجل، اور اسی طرح جو کچھ اس کے لیے مقرر کر دیا گیا ہے، اسے پورا نہ کر لے۔''

قضاء وقدر کا مسئلہ اسلامی مکاتبِ فکر میں ایک معرکۃُ الآراء مسئلہ رہا ہے۔ اس مسئلے کے بارے میں 'اہلِ سُنّۃ' کی رائے کا خلاصہ یہ ہے کہ انسان کو اپنے افعال میں کسبِ اختیار یحاصل ہے اور اسی کسبِ اختیار یکی بنیاد پر اس کا محاسبہ ہوگا۔ مُعْتَزِلَہ کی رائے کا خلاصہ یہ ہے کہ انسان ہی اپنے افعال کا خالق ہے اور انسان کا محاسبہ اس وجہ سے ہوگا کہ وہ اپنے افعال کا خود موجد ہے۔ اور اس مسئلے میں جَبْرِیّہ کی رائے کا نچوڑ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی انسان کا اور اس کے افعال کا خالق ہے۔ اس لیے بندے کو اپنے افعال پر کوئی اختیار نہیں، بلکہ وہ محض مجبور ہے۔ بندے کی مثال اس پَر کی سی ہے جو فضاء میں ہو، اور جس کو ہوائیں جدھر چاہیں، اڑا رہی ہوں۔

قضاء وقدر کے مسئلے کے بارے میں ایک باریک بین انسان اس بات کو جان جائے گا کہ اس مسئلے کے متعلق صحیح فہم حاصل کرنے کے لیے اس مسئلے کی بنیاد کو سمجھنا ضروری ہے۔ بندے کے افعال اس مسئلہ کی بنیاد نہیں کہ آیا بندہ خود اپنے فعل کا خالق ہے یا اللہ تعالیٰ اس کے فعل کا خالق ہے۔ نہ یہ بنیاد اللہ تعالیٰ کا علم ہے کہ اللہ پہلے سے ہی جانتا تھا کہ یہ بندہ کیا عمل کرے گا، یعنی اللہ تعالیٰ کے علم نے انسان کا احاطہ کیا ہوا ہے۔ نہ یہ بنیاد اللہ تعالیٰ کا ارادہ ہے، جو انسان کے فعل سے متعلق ہو، اس طرح کہ جب اللہ کا ارادہ ہو تو وہ فعل لازماً وقوع پزیر ہو گا۔ نہ وہ بنیاد یہ ہے کہ بندے کا یہ فعل لوحِ محفوظ میں لکھا ہوا ہے، تو بندہ اس لکھے ہوئے کے مطابق یہ فعل لازماً سرانجام دے گا۔

جی ہاں! یہ امور اس بحث کی بنیاد ہر گز نہیں۔ کیونکہ ثواب وعذاب کے حوالے سے ان امور کا اس موضوع سے کوئی تعلق نہیں۔ بلکہ ان اشیاء کا تعلق عمل کی انجام دہی، ہر شے کا احاطہ کرنے والے علم، تمام ممکنات سے متعلق اللہ کے ارادے اور لوحِ محفوظ کے تمام اشیاء پر مشتمل ہونے سے ہے۔ یہ تعلق ایک الگ موضوع ہے اور یہ عمل کے نتیجے میں عقاب یا ثواب سے بالکل جُدا موضوع ہے۔ یعنی یہاں موضوعِ بحث یہ ہے کہ کیا انسان اپنے عمل کی انجام دہی میں مجبور ہے یا مختار، خواہ اس کا یہ عمل خیر ہو یا شر؟ اور کیا اُسے عمل کی انجام دہی یا عمل کو ترک کرنے کا اختیار حاصل ہے یا نہیں؟

افعال کو باریک بینی سے دیکھنے والا مشاہدہ کر سکتا ہے کہ انسان دو دائروں میں زندگی گزارتا ہے۔ ایک دائرے پر انسان خود حاوی ہے۔ یہ وہ دائرہ ہے جو انسان کے تصرفات کے تحت آتا ہے۔ اور اس دائرے میں رہتے ہوئے انسان جو افعال سرانجام دیتا ہے، ان پر انسان کو اختیار حاصل ہوتا ہے۔ دوسرا دائرہ وہ ہے، جو انسان پر حاوی ہے، یعنی اس دائرے کے اندر جتنے بھی افعال آتے ہیں، ان پر انسان کو کوئی اختیار حاصل نہیں، خواہ یہ افعال انسان کی جانب سے وقوع پزیر ہوں یا یہ خود انسان پر واقع ہوں۔

پس وہ افعال، جو اُس دائرے میں آتے ہیں، جو انسان پر حاوی ہے اور ان میں انسان کا کوئی عمل دخل نہیں اور ان کے رونما ہونے سے انسان کو کوئی سروکار نہیں، اِن افعال کی دو اقسام ہیں: ایک وہ افعال ہیں، جن کا نظامِ کائنات تقاضا کرتا ہے۔ اور دوسری قسم ان افعال کی ہے، جو انسان کی قدرت میں نہیں اور انسان ان کو ٹال بھی نہیں سکتا لیکن نظامِ کائنات ان کا تقاضا نہیں کرتا۔ جہاں تک اُن افعال کا تعلق ہے، جن کا نظامِ کائنات تقاضا کرتا ہے تو انسان اِن کے سامنے سرنگوں ہوتا ہے اور مجبوراً ان کے مطابق چلتا ہے۔ کیونکہ انسان کو کائنات اور حیات کے ساتھ ایک مخصوص قانون کے مطابق ہی چلنا ہے، جو تبدیل نہیں ہوتا۔ انسان اس کی مخالفت نہیں کر سکتا۔ اس لیے اس دائرے کے افعال انسان کے ارادے سے باہر ہیں۔ انسان کو ہر حال میں اس کے مطابق چلنا ہے اور اس دائرے میں اسے کوئی اختیار حاصل نہیں۔ جیسا کہ انسان دنیا میں اپنے ارادے کے بغیر آیا اور یہاں سے اپنی مرضی کے بغیر چلا جائے گا۔ انسان اپنے جسم کے بل بوتے پر ہوا میں اُڑ نہیں سکتا اور نہ ہی وہ طبعی طور پر پانی پر چل سکتا ہے۔ اسی طرح وہ اپنی آنکھوں کا رنگ خود نہیں بنا سکتا اور نہ اپنے سر کو جیسا چاہے ویسا بنا سکتا ہے اور نہ ہی اپنی جسامت کو اپنی مرضی کے مطابق جیسے چاہے بنا سکتا ہے۔ ان تمام کاموں کو کرنے والا صرف اللہ تعالیٰ ہے۔ ان کاموں میں مخلوق (بندے) کا کوئی عمل دخل نہیں ہوتا۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ ہی نے نظامِ کائنات کو بنایا ہے، اور اللہ تعالیٰ ہی نے اسے منظم کیا ہے۔ چنانچہ انسان اس کے مطابق چلتا ہے اور اس کی خلاف ورزی کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتا۔

وہ افعال، جو انسان کی طاقت سے باہر ہیں اور وہ انہیں ٹال بھی نہیں سکتا اور وہ نظامِ کائنات میں سے بھی نہیں، یہ وہ افعال ہیں انسان جن کا مجبوراً ارتکاب کرتا ہے یا یہ انسان پر جبراً واقع ہوتے ہیں اور انسان ان سے بچ نہیں سکتا، مثلاً ایک شخص دیوار پر سے دوسرے شخص پر گرے، جس کے نتیجے میں دوسرا شخص مر جائے یا کوئی شخص کسی پرندے پر گولی چلائے لیکن یہ گولی پرندے کی بجائے کسی ایسے شخص کو جا لگے، جس کو گولی چلانے والا شخص جانتا بھی نہ ہو اور وہ مر جائے۔ اسی طرح ریل گاڑی یا موٹر کار کا حادثہ ہو جائے یا جہاز کسی ایسی فنی خرابی کی وجہ سے گر کر تباہ ہو

جائے، جس کا ازالہ ممکن نہیں تھا، چنانچہ اس حادثے یا گرنے کی وجہ سے اس میں سوار افراد ہلاک ہو جائیں یا اسی قسم کا کوئی اور واقعہ پیش آ جائے۔ تو یہ افعال خواہ انسان کی جانب سے ہوئے ہوں یا انسان کے اوپر واقع ہوئے ہوں، اور اگرچہ نظامِ کائنات ان کا تقاضا نہیں کرتا لیکن چونکہ یہ انسان کی جانب سے یا اس کے اوپر اس کے ارادے کے بغیر واقع ہوئے ہیں، لہٰذا یہ انسانی قدرت و طاقت سے باہر ہیں۔ پس یہ افعال اُس دائرے میں داخل ہیں جو انسان پر حاوی ہے۔ جو افعال اس دائرے میں داخل ہیں، جو انسان پر مسلط (حاوی) ہے، تو انہیں قضاء کہا جاتا ہے، کیونکہ ان تمام افعال کے وقوع پزیر ہونے کا فیصلہ صرف اللہ تعالیٰ ہی کرتا ہے۔ لہٰذا ان افعال پر انسان کا محاسبہ نہیں ہوگا، خواہ انسان کے لیے ان میں کتنا ہی فائدہ یا نقصان اور پسند یا ناپسندیدگی کی بات کیوں نہ ہو، یعنی انسان کی تفسیر کے مطابق ان میں کتنا ہی خیر و شر کیوں نہ ہو۔ کیونکہ ان افعال میں پائے جانے والے خیر و شر کو صرف اللہ ہی جانتا ہے انسان ان افعال پر اثر انداز نہیں ہو سکتا۔ انسان کو نہ تو ان افعال کا علم ہوتا ہے اور نہ ہی ان کے وجود میں آنے کا، چنانچہ انسان انہیں روکنے یا ان سے بچنے کی طاقت بھی نہیں رکھتا۔ انسان پر لازم ہے کہ وہ اس بات پر ایمان رکھے کہ یہ قضاء ہے اور اللہ سبحانہ و تعالیٰ کی طرف سے ہے۔

اب رہی بات قدر کی، تو یہ بات ظاہر ہے کہ تمام افعال، خواہ وہ اُس دائرے سے تعلق رکھتے ہوں جو انسان پر حاوی ہے یا وہ اس دائرے کے ماتحت ہوں جس پر انسان حاوی ہے، کائنات انسان اور حیات کے ذریعے رُونما ہوتے ہیں یا کائنات انسان اور حیات پر واقع ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان تمام اشیاء کے لیے کچھ خاصیتیں متعین کی ہیں۔ مثلاً اللہ تعالیٰ نے آگ میں جلانے کی خاصیت رکھ دی، لکڑی میں جلنے کی صفت رکھ دی اور چُھری میں کاٹنے کی تاثیر رکھ دی۔ پھر اللہ تعالیٰ نے ان خاصیتوں کو اشیاء کے لیے لازم قرار دے دیا اور یہ اشیا کبھی بھی ان خاصیتوں کی خلاف ورزی نہیں کرتیں۔ جب کبھی یہ اشیاء اپنی فطرت کی خلاف ورزی کرتی ہیں تو اُس وقت اللہ تعالیٰ نے اِن کی یہ خاصیت سلب کی ہوتی ہے اور یہ ایک خلافِ معمول اَمر ہوتا ہے جو انبیاء سے بطورِ معجزہ صادر ہوتا ہے۔ جس طرح اللہ تعالیٰ نے اشیاء کے اندر خاصیتیں پیدا فرمائی ہیں، اسی طرح اللہ تعالیٰ نے انسانوں کے اندر جبلتیں اور جسمانی حاجات رکھ دی ہیں۔ پھر ان

جبلتوں اور جسمانی حاجات کے اندر بھی اشیاء کی خاصیتوں کی مانند کچھ متعین خاصیات پیدا کر دی ہیں۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے جبلتِ نوع میں جنسی میلان تخلیق کر دیا، جسمانی حاجات میں بعض خاصیتیں رکھ دیں مثلاً بھوک اور پیاس وغیرہ۔ پھر نظامِ کائنات کے مطابق انہیں لازم بنا دیا۔ پس اشیاء اور انسان کی یہ متعین خاصیات، جنہیں اللہ تعالیٰ ہی نے پیدا فرمایا ہے، 'قدر' کہلاتی ہیں، کیونکہ اللہ ہی نے اشیاء، جبلتوں اور جسمانی حاجات کی تخلیق کی ہے اور ان کے اندر ان کی خصوصیات کے اندازے (یعنی قدر) مقرر کر دیے ہیں۔ یہ خصوصیات خود ان اشیاء کی پیدا کردہ نہیں اور نہ ہی بندے کو ان سے کوئی سروکار ہے اور نہ بندے کا اس میں کوئی عمل دخل ہے۔ انسان کو اس بات پر ایمان رکھنا چاہیے کہ صرف اللہ ہی نے ان اشیاء کے اندر خاصیات ودیعت فرما دی ہیں۔ ان خاصیتوں کے اندر یہ قابلیت ہے کہ انسان ان کے ذریعے اللہ تعالیٰ کے احکامات کے موافق بھی عمل کر سکتا ہے، جو کہ خیر ہے اور اللہ کے احکامات کے مخالف عمل بھی کر سکتا ہے، جو کہ شر ہے۔ خواہ اللہ تعالیٰ کا یہ حکم ان اشیاء کو ان کی خصوصیات کے مطابق استعمال کرنے کے حوالے سے ہو یا جبلتوں اور جسمانی حاجات کو پورا کرنے کے لحاظ سے ہو۔ اگر یہ افعال اللہ کے اوامر ونواہی کے مطابق ہوں گے، تو خیر کہلائیں گے اور اگر اللہ کے اوامر ونواہی کے خلاف ہوں گے، تو شر کے زمرے میں آئیں گے۔

یہیں سے معلوم ہوا کہ وہ افعال، جو اُس دائرے میں سے ہیں جو انسان پر حاوی ہے، وہ اللہ کی طرف سے ہیں، خواہ وہ خیر ہوں یا شر۔ وہ خاصیتیں، جو اشیاء اور جبلتوں اور جسمانی حاجات میں پائی جاتی ہیں، وہ بھی اللہ کی طرف سے ہیں، خواہ ان کا نتیجہ خیر ہو یا شر۔ یہی وجہ ہے کہ مسلمان کو قضاء پر ایمان رکھنا چاہیے، قطع نظر اس بات کے، کہ وہ خیر ہو یا شر۔ یعنی وہ یہ اعتقاد رکھے کہ وہ افعال جو انسان کے دائرہ اختیار سے باہر ہیں، وہ اللہ کی طرف سے ہیں۔ اور اسی طرح وہ قدر کے خیر وشر کے بھی مِن جانب اللہ ہونے پر ایمان رکھے۔ یعنی وہ یہ اعتقاد رکھے کہ اشیاء کے اندر موجود خواص طبعی لحاظ سے اللہ کی طرف سے ہیں، خواہ ان کا نتیجہ خیر ہو یا شر اور انسان ان پر اثر انداز نہیں ہو سکتا۔ پس انسان کی اجل (موت کا مقررہ وقت)، اس کا رزق اور اس کی روح، سب اللہ کی قدرت میں ہیں۔ جس طرح جبلتِ نوع کے اند

ر پایا جانے والا جنسی میلان، جبلتِ بقاء کے اندر موجود ملکیت کی خواہش اور اسی طرح جسمانی حاجات جیسا کہ بھوک اور پیاس، سب کے سب مِن جانب اللہ ہیں۔

یہ تمام اشیاء کی خاصیتوں کے بارے میں اور اُن افعال کے بارے میں تھا، جو اُس دائرے میں ہیں، جو انسان پر حاوی ہے۔ جہاں تک دوسرے دائرے کا تعلق ہے، جس پر انسان خود حاوی ہے، تو یہ وہ دائرہ ہے کہ جس کے اندر انسان اپنے اختیار کردہ نظام کے مطابق اختیاری طور پر چلتا ہے، خواہ یہ نظام اللہ تعالیٰ کی مقرر کردہ شریعت ہو یا کوئی اور نظام۔ یہی (افعال کا) وہ دائرہ ہے، جس میں افعال انسان سے صادر ہوتے ہیں، یا اس پر واقع ہوتے ہیں اور اس کے اپنے ارادے سے ہوتے ہیں۔ پس وہ جب چاہتا ہے، چلتا ہے، کھاتا ہے، پیتا ہے اور سفر کرتا ہے۔ اور اگر وہ نہ چاہے تو ان افعال سے رُک جاتا ہے۔ وہ جب چاہتا ہے آگ کے ذریعے آگ لگاتا ہے، چھری سے کاٹتا ہے اور جس طرح چاہتا ہے نوع کی حاجت اور ملکیت کی حاجت کو پورا کرتا ہے اور معدے کی بھوک کو بُجھاتا ہے۔ یعنی وہ جو عمل چاہے کرتا ہے اور جس عمل سے چاہتا ہے اجتناب کرتا ہے۔ لہٰذا اس دائرے کے افعال کے بارے میں وہ جوابدہ ہو گا۔

اگرچہ ان اشیاء کی خاصیتیں، جبلتیں اور جسمانی حاجات کی خاصیتیں اللہ تعالیٰ ہی نے مقرر (مقدر) کی ہیں اور ان خاصیتوں کو اِن اشیاء کے لیے لازم کر دیا ہے اور ان خاصیتوں کا افعال کے نتائج پر بڑا اثر ہے، لیکن یہ خاصیتیں بذاتِ خود عمل کو جنم نہیں دیتیں۔ بلکہ انسان انہیں استعمال کرتے ہوئے ان کے ذریعے اعمال سرانجام دیتا ہے۔ پس جبلتِ نوع کے اندر موجود جنسی رجحان میں خیر و شر دونوں طرح کی قابلیت موجود ہے۔ اسی طرح جسمانی حاجت کے اندر موجود بھوک میں خیر و شر دونوں قسم کی قابلیت پائی جاتی ہے۔ لیکن خیر و شر کا کام کرنے والا انسان ہے نہ کہ جبلّت یا جسمانی حاجت۔ پھر اللہ تعالیٰ نے انسان کو تمیز کرنے والی عقل سے نوازا ہے، اور عقل میں طبعی طور پر تمیز کرنے اور ادراک کرنے کی صلاحیت رکھی ہے۔ اور اللہ تعالیٰ نے انسان کو خیر و شر دونوں راستے بھی بیان کر دیے ہیں۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

(وَهَدَيْنَاهُ النَّجْدَيْنِ)

''ہم نے اسے دونوں نمایاں راستے بتادیئے''(البلد:10)

اور اللہ تعالیٰ نے انسان میں گناہوں اور تقویٰ کے کاموں کا ادراک کرنے کی صلاحیت رکھ دی ہے:

(فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰهَا)

''اس نے اسے فجور و تقویٰ کا الہام کر دیا''(الشمس:8)

پس جب انسان اپنی جبلتوں اور جسمانی حاجات کو اللہ تعالیٰ کے اوامر و نواہی کے مطابق پورا کرتا ہے، تو یہ فعل خیر ہوتا ہے اور انسان تقویٰ کی راہ پر گامزن ہوتا ہے۔ لیکن جب انسان اپنی جبلتوں اور جسمانی حاجات کو اللہ تعالیٰ کے اوامر و نواہی سے منہ موڑ کر پورا کرتا ہے، تو یہ فعل شر ہوتا ہے اور یوں انسان گناہوں کے رستے پر چلتا ہے۔ بہر حال ان تمام افعال میں انسان ہی سے اس خیر و شر کا ظہور ہوتا ہے۔ انسان جب اللہ تعالیٰ کے اوامر و نواہی کے موافق اپنی جبلتوں اور عضویاتی ضرورتوں کو پورا کرتا ہے، تو اس کا یہ فعل خیر ہوتا ہے۔ جب انسان اپنی جبلتوں اور جسمانی حاجات کو اللہ تعالیٰ کے اوامر و نواہی کے برخلاف پورا کرتا ہے تو اس کا یہ فعل شر ہوتا ہے۔ اس بنیاد پر انسان کا ان افعال کے بارے میں محاسبہ ہوگا، جو اُس دائرے میں ہیں، جس پر انسان حاوی ہے۔ اس کے نتیجے میں اسے عذاب یا ثواب ملے گا کیونکہ اس نے بغیر کسی جبر و اکراہ کے، اختیاری طور پر یہ افعال سرانجام دیئے۔ جبلّتیں اور جسمانی حاجات کی خاصیتیں اگرچہ اللہ کی جانب سے ہیں اور ان کی خیر و شر کی قابلیت بھی اللہ ہی کی طرف سے ہے، لیکن اللہ تعالیٰ نے ان خاصیتوں کو اس طرح نہیں بنایا کہ عمل کی ادائیگی کے وقت وہ خاصیت انسان کو اللہ کی رضا یا ناراضی کے مطابق اپنے استعمال پر مجبور کرے، خواہ اس کا تعلق خیر سے ہو یا شر سے۔ جیسا کہ جلانے کی صفت ہے، یہ صفت اس طرح نہیں کہ انسان کو کسی چیز کو جلانے پر مجبور کرتی ہو، چاہے وہ عمل اللہ کی خوشنودی کا ہو یا اس کی ناراضی کا، یعنی وہ عمل خیر ہو یا شر۔ یہ خاصیتیں تو اس طرح ہیں کہ انسان عمل کی انجام دہی کے وقت جس طرح چاہے انہیں کام میں لا سکتا ہے۔ جب اللہ

تعالیٰ نے انسان کو پیدا فرمایا تو اس کے اندر یہ جبلتیں اور حاجات پیدا فرمادیں، پھر اسے تمیز کرنے والی عقل عطا کر دی، او راسے اختیار دے دیا کہ وہ جس عمل کو چاہے کرے، اور جس سے چاہے اجتناب کرے، اور اللہ نے کسی کام کے کرنے یا چھوڑنے پر اسے مجبور نہیں کیا، اور اشیاء نیز جبلتوں اور عضویاتی حاجات کی خاصیتوں کو ایسا نہیں بنایا کہ فعل کو سرانجام دیتے وقت یا اس سے کنارہ کشی اختیار کرتے ہوئے یہ خاصیت انسان کو مجبور کرے۔ یوں انسان کسی فعل کو بجالانے یا اس سے دست کش ہونے میں بااختیار ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اسے فرق کرنے والی عقل سے نوازا ہے اور اسے شرعی طور پر مکلف کر دیا ہے۔ اس لیے اچھا عمل کرنے کی صورت میں اس کے لیے ثواب ہے، کیونکہ اس کی عقل نے اللہ کے اوامر کو اختیار کیا اور اس کے نواہی سے اجتناب کیا۔ اسی طرح بُرا عمل کرنے کی صورت میں وہ سزا کا مستحق ہے، کیونکہ اس کی عقل نے اللہ کے اوامر کی مخالفت کرنے کو اختیار کیا اور جبلتوں اور عضویاتی حاجات کو اللہ کے بتائے ہوئے راستے سے ہٹ کر پورا کیا۔ اس لیے اس عمل پر اسے سزا دینا عین عدل وانصاف ہے، کیونکہ وہ عمل کرنے میں بااختیار تھا، اور وہ کسی لحاظ سے بھی مجبور نہ تھا۔ قضاء وقدر کا اس سے کوئی تعلق نہیں، بلکہ مسئلہ یہ ہے کہ بندے نے خود اپنے اختیار سے کوئی عمل کیا اور وہ اپنے عمل کے بارے میں مسؤل ہوگا:

(كُلُّ نَفْسٍ بِّمَاكَسَبَتْ رَهِيْنَةٌ)

''ہر انسان اپنے کسب (عمل) کے ہاتھوں گروی ہے'' (المدثر:38)

اب رہی بات اللہ تعالیٰ کے علم کی، تو اللہ کا علم کبھی بھی بندے کو کسی عمل کے کرنے پر مجبور نہیں کرتا۔ کیونکہ اللہ کو یہ معلوم تھا کہ یہ بندہ اپنے اختیار ہی سے یہ عمل کرے گا۔ انسان کا عمل اللہ تعالیٰ کے علم کی وجہ سے نہیں، بلکہ اللہ کو ازل سے یہ علم ہوتا ہے کہ یہ انسان یہ عمل کرے گا۔ اور جہاں تک لوحِ محفوظ کا تعلق ہے تو اس سے مراد بھی یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ کا علم ہر چیز کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔

جہاں تک اللہ کے ارادے کا تعلق ہے تو یہ بھی بندے کو کسی عمل پر مجبور نہیں کرتا، بلکہ اللہ کے ارادے کا یہ مطلب ہے کہ کائنات میں اللہ تعالیٰ کے ارادے کے بغیر کوئی چیز وجود میں نہیں آسکتی، یعنی کوئی چیز کائنات میں اللہ کے ارادے کے بغیر زبردستی وقوع پزیر نہیں ہوسکتی۔ پس جب بندہ کوئی عمل کرتا ہے، تو اللہ بندے کو اس سے روکتا ہے، نہ ہی اُسے اِس عمل کے کرنے پر مجبور کرتا ہے بلکہ اللہ نے اسے بااختیار چھوڑ دیا ہے۔ یہ امر (اسے بااختیار چھوڑنا) اللہ کے ارادے سے ہے، نہ کہ اللہ نے انسان کو مجبور کر دیا۔ بندے کا فعل خود اس کے اپنے اختیار سے ہے اور اللہ کا ارادہ کبھی بھی اسے عمل پر مجبور نہیں کرتا۔

یہ ہے قضاء وقدر کا مسئلہ! یہ انسان کو اچھے کاموں کو سرانجام دینے اور بُرے کاموں سے رُکنے پر آمادہ کرتا ہے، کیونکہ انسان کو معلوم ہوتا ہے کہ اللہ دیکھ رہا ہے اور وہ اس کا محاسبہ کرے گا۔ اللہ نے اسے عمل کرنے یا چھوڑنے کا اختیار دے دیا ہے۔ پس انسان افعال کی انجام دہی میں حاصل اس اختیار کو اچھے طریقے سے استعمال نہیں کرے گا تو اس کے لیے ہلاکت اور شدید ترین عذاب ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ ایک سچا اور قضاء وقدر کی حقیقت کو سمجھنے والا، اللہ کی دی ہوئی عقل اور اختیار کی نعمت کی حقیقت کو پہچاننے والا مؤمن، انتہائی محتاط اور اللہ سے سخت ڈرنے والا ہوتا ہے۔ وہ اللہ کے اوامر کو بجالانے والا اور اللہ کے عذاب سے ڈرتے ہوئے اور جنت کی امید رکھتے ہوئے، اللہ کے منع کیے ہوئے کاموں سے رکتا ہے۔ اس سے بڑھ کر وہ اللہ کی خوشنودی کے حصول کے لیے ہمیشہ نیک اعمال کی لگن میں رہتا ہے۔

اسلام کی فکری قیادت

جب بھی انسان فکری پستی میں مبتلا ہوتا ہے تو لوگوں میں وطن پرستی کا ربط و تعلق نشو و نما پاتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ ایک ہی سرزمین پر رہ رہے ہوتے ہیں اور اسی کے ساتھ چمٹ کر رہ جاتے ہیں۔ چنانچہ انسان اپنے اندر موجود جبلتِ بقا کی گرفت میں آجاتا ہے اور یہ (جبلتِ بقا) اسے اپنے ملک اور اپنی سرزمین کا دفاع کرنے پر اُبھارتی ہے، جہاں پر یہ زندگی گزار رہا ہوتا ہے۔ یہیں سے وطنیت کا رشتہ جنم لیتا ہے۔ وطن کے ساتھ یہ رشتہ و تعلق تمام تعلقات میں سے کمزور ترین اور پست ترین تعلق ہوتا ہے۔ اپنے وطن کے ساتھ یہ تعلق اور میلان تو حیوانات اور پرندوں میں بھی موجود ہوتا ہے اور اس کا اظہار ہمیشہ جذباتی انداز میں ہوتا ہے۔ اس جذبے اور تعلق کا اظہار صرف اس وقت ہوتا ہے جب کوئی بیرونی دشمن وطن پر حملہ آور ہوتا ہے یا وطن پر قبضہ کر لیتا ہے۔ لیکن جب وطن دشمن سے محفوظ ہو جائے تو یہ رشتہ مؤثر نہیں رہتا اور اس تعلق کا عمل اس وقت ختم ہو کر رہ جاتا ہے جب بیرونی دشمن کو مار بھگایا جا چکا ہو یا باہر نکالا جا چکا ہو۔ یہی وجہ ہے کہ یہ انتہائی کمزور اور پست تعلق و رابطہ ہے۔

اسی طرح جب انسانی فکر تنگ اور محدود ہو جاتی ہے تو انسان کے اندر قومیت کا تعلق پروان چڑھتا ہے۔ قوم کے ساتھ یہ تعلق اور لگاؤ خاندانی تعلق کی ایک زیادہ وسیع شکل ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جب جبلتِ بقا انسان کے اندر اپنی جڑیں مضبوط کر لیتی ہے تو اس کے اندر غلبے اور سیادت (سرداری) کی محبت ابھر آتی ہے۔ ایک پست فکر کے حامل شخص میں یہ محبت انفرادی نوعیت کی ہوا کرتی ہے۔ پھر جب اس انسان کے اندر ذرا بیداری اور فکری بلندی پیدا ہوتی ہے تو اُس کی حُبِ سیادت میں بھی وسعت آجاتی ہے، اور یوں اپنے کنبے اور خاندان کی سیادت و قیادت اس کا نصب العین بن جاتا ہے۔ پھر جب اسے یہ مقام حاصل ہو جاتا ہے، تب وہ اپنے علاقے پر اپنی قوم کی سیادت قائم کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ پھر جب اسے یہ مقام بھی مل جاتا ہے تب وہ اپنی قوم کی سیادت کو دوسری اقوام پر مسلّط کرنے کا سوچتا ہے۔ چنانچہ ایک خاندان کے افراد کے اندر سیادت و قیادت کے حصول کے لیے جھگڑے عموماً ہو جاتے ہیں۔ پھر

جب اس خاندان کا کوئی فرد خاندان کے باقی افراد پر غالب آجاتا ہے اور اس کی سیادت مستحکم ہو جاتی ہے، تو اس خاندان اور دیگر خاندانوں کے درمیان کشمکش شروع ہو جاتی ہے، یہاں تک کہ ایک خاندان یا مختلف خاندانوں سے تعلق رکھنے والے لوگوں کے ایک گروہ کی سرداری قائم ہو جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس تعلق اور ربط کے حامل افراد کے اندر عصبیت کوٹ کوٹ کر بھری ہوتی ہے اور ان کے اندر باقی لوگوں کے خلاف کچھ لوگوں کی مدد کرنے کی خواہش اور جذبہ پروان چڑھتا ہے۔ چنانچہ یہ تعلق اور ربط ایک غیر انسانی رابطہ اور تعلق ہے۔ لہٰذا اس قسم کے ربط میں اگر خارجی مخاصمت اور چیلنجوں کا سامنا نہ بھی کرنا پڑے، تو داخلی خلفشار اور جھگڑے تو ہمیشہ ہوتے ہی رہتے ہیں۔

پس وطنیت کا ربط تین اسباب کی بناء پر غلط ربط یا تعلق ہے: اول: یہ ربط ایک پست ربط اور تعلق ہے۔ لہٰذا جب لوگ نشاۃ ثانیہ کے راستہ پر چلنا چاہیں تو یہ اُنہیں مربوط اور منظم نہیں کر سکتا۔ دوم: یہ ایک جذباتی ربط اور تعلق ہے، جو اپنی ذات کے دفاع کے حوالے سے جبلتِ بقا سے پیدا ہوتا ہے اور جذباتی ربط ہمیشہ تغیر و تبدل کا شکار رہتا ہے۔ اس لیے یہ انسانوں کے درمیان دائمی رابطے اور تعلق کا باعث نہیں بن سکتا۔ سوم: یہ ایک وقتی اور عارضی ربط و تعلق ہے، جو دفاع کی حالت میں تو پایا جاتا ہے، لیکن امن و سکون کی حالت میں ناپید ہوتا ہے۔ اس لیے یہ بنی نوع انسان کے مابین ربط و تعلق بننے کا اہل نہیں ہو سکتا۔

اسی طرح قومی ربط بھی تین اسباب کی وجہ سے فاسد و غلط ربطہ ہے:

اول: یہ ایک قبائلی جذبہ ہے، اس لیے جب لوگ نشاۃ ثانیہ کے راستہ پر چلنا چاہیں تو یہ انہیں مربوط نہیں کر سکتا۔ دوم: یہ ایک جذباتی نوعیت کا ربط اور تعلق ہے، جو جبلتِ بقا سے پیدا ہوتا ہے اور اسی سے دوسروں پر غلبہ حاصل کرنے کی محبت جنم لیتی ہے۔ سوم: یہ ایک غیر انسانی ربط ہے کیونکہ یہ غلبے کے حصول کے لیے لوگوں کے درمیان جھگڑے اور تنازعات پیدا کرنے کا سبب بنتا ہے۔ اس لیے یہ بھی انسانوں کے مابین ربطِ باہمی بننے کا اہل نہیں۔

اسی طرح کے فاسد روابط میں ایک رابطہ مصلحت کا رابطہ ہے اور دوسرا ایسا روحانی رابطہ جس سے کوئی نظام نہیں پھوٹتا۔ کچھ لوگ خیال کرتے ہیں کہ یہ دونوں انسانوں کے مابین باہمی ربط و تعلق کا سبب ہو سکتے ہیں، لیکن یہ سراسر غلط ہے۔ جہاں تک مصلحت (فوائد اور نفع) کے ربط کی بات ہے، تو یہ بھی ایک وقتی ربط ہونے کی وجہ سے نوعِ انسانی کے مابین ربط و تعلق بننے کا اہل نہیں۔ کیونکہ یہ ربط بڑے فائدے کے سامنے چھوٹے فائدے کو داؤ پر لگا دینے کا شکار بنا رہتا ہے۔ اس لیے ایک مصلحت کو دوسری مصلحت پر ترجیح دیتے وقت یہ ربط مفقود ہو جاتا ہے۔ اور جب فائدے ایک دوسرے سے مختلف ہو جائیں، تو اس صورت میں بھی یہ ربط ختم ہو جاتا ہے اور یوں لوگ ایک دوسرے سے جُدا ہو جاتے ہیں۔ علاوہ ازیں جب فائدے پورے ہو جائیں تو یہ رابطہ بھی اختتام کو پہنچ جاتا ہے۔ اس لیے اس ربط کو لوگوں کے مابین باہمی تعلق کا سبب گرداننا انسانوں کے لیے انتہائی خطرناک ہے۔ جہاں تک اُس روحانی رابطے کی بات ہے، جس سے کوئی نظام پیدا نہیں ہوتا، تو یہ ربط 'حالتِ تدین' میں تو ظاہر ہوتا ہے لیکن کارزارِ حیات میں اس کا کوئی کردار نہیں ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ یہ ربط بھی ایک ادھورا اور غیر عملی ربط ہے۔ چنانچہ یہ بھی زندگی کے مسائل و معاملات میں لوگوں کے درمیان رابطہ و تعلق بننے کا اہل نہیں۔ اور اسی وجہ سے 'نصرانی عقیدہ' یورپی اقوام اور گروہوں کے مابین مربوط تعلق کا سبب نہیں بن سکا۔ باوجود یہ کہ ان سب اقوام نے اس عقیدے کو اپنایا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ ایک ایسا روحانی ربط ہے، جس میں سے کوئی نظام نہیں نکلتا۔

چنانچہ جب لوگ نشاۃِ ثانیہ کی راہ پر چلنا چاہیں تو مذکورہ تمام روابط انہیں باہم مربوط نہیں کر سکتے۔ اس کے برعکس زندگی میں انسانوں کو باہم مربوط رکھنے کا صحیح ترین ربط صرف اس عقلی عقیدے کا ربط ہو سکتا ہے جس کے اندر سے کوئی نظام پھوٹتا ہو اور یہ صرف ایک مبدَا (آئیڈیالوجی) کا ربط ہی ہو سکتا ہے۔

مبداء یعنی آئیڈیالوجی سے مراد وہ عقلی عقیدہ ہے جس سے کوئی نظام پھوٹتا ہو۔ عقیدہ کائنات، انسان، حیات اور اس سے قبل و بعد کے اس دنیاوی زندگی کے ساتھ تعلق کے بارے میں کُلی فکر کو کہا جاتا ہے۔ جہاں تک اس

عقیدے سے پھوٹنے والے نظام کا تعلق ہے، تو یہ انسان کی مشکلات کے حل، اس حل کو نافذ کرنے کی کیفیت، عقیدہ کی حفاظت اور آئیڈیالوجی کو دوسرے لوگوں تک پہنچانے پر مشتمل ہوتا ہے۔ اس حل کو نافذ کرنے کی کیفیت، آئیڈیالوجی کی حفاظت اور اس کو دوسرے لوگوں تک لے جانا ''طریقہ'' کہلاتا ہے۔ عقیدہ اور حل کو ''فکر'' کہا جاتا ہے۔ معلوم ہوا کہ آئیڈیالوجی فکر اور طریقے کا مجموعہ ہے۔

اب یہ آئیڈیالوجی کسی شخص کے ذہن میں یا تو وحی کی بنیاد پر پیدا ہو گی، جس کی تبلیغ کرنے کا اسے حکم دیا گیا ہو، یا کسی شخص کی غیر معمولی ذہانت کی وجہ سے اُس کے ذہن میں پیدا ہو گی۔ صحیح آئیڈیالوجی وہی ہے، جو کسی انسان کے ذہن میں وحی الٰہی کے ذریعے پیدا ہوئی ہو۔ کیونکہ یہ آئیڈیالوجی اس ذات کی طرف سے ہے، جو کائنات، انسان اور حیات کی خالق ہے۔ لہٰذا صرف یہی آئیڈیالوجی صحیح اور قطعی ہے۔ وہ آئیڈیالوجی جو کسی انسان کے ذہن میں اس کی غیر معمولی ذہانت کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے، وہ باطل آئیڈیالوجی ہے۔ کیونکہ یہ عقل سے پیدا ہوتی ہے اور عقل محدود ہے، جو تمام کائنات کا احاطہ کرنے سے عاجز ہے۔ اس کے باطل ہونے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ انسانوں میں پایا جانے والا تنظیمی فہم، ہمیشہ تفاوت، اختلاف اور تضاد سے دوچار رہتا ہے، اور یہ فہم اس معاشرے سے بھی متاثر ہوتا ہے، جس میں انسان رہ رہا ہو۔ اس لیے اس فہم کے نتیجے میں پیدا ہونے والا متناقض نظام انسانی بد بختی پر منتج ہو گا۔ اس لیے انسان کے ذہن سے جنم لینے والی آئیڈیالوجی اپنے عقیدے اور اس عقیدے سے پھوٹنے والے نظام کے اعتبار سے باطل ہو گی۔

اسی بنیاد پر کہا جاسکتا ہے کہ آئیڈیالوجی کی بنیاد کائنات، انسان اور حیات کے بارے میں کُلی فکر ہے۔ اس آئیڈیالوجی میں ایسے طریقے کا پایا جانا ایک لازمی امر ہے، جو اسے زندگی کے میدان میں نافذ کرے اور وجود بخشے۔ اس طریقہ کے بغیر کوئی آئیڈیالوجی وجود پذیر نہیں ہو سکتی۔ کائنات انسان اور حیات کے بارے میں کُلی فکر آئیڈیالوجی کی اساس ہوتی ہے، اور یہی کلی فکر آئیڈیالوجی کا عقیدہ ہے، اور یہی اس کا فکری قاعدہ اور اس کی فکری قیادت ہے۔ اس کی

بنیاد پر انسان کی فکری جہت اور زندگی کے بارے میں اس کے نقطہ نظر کا تعیّن ہوتا ہے۔ یہی تمام افکار کی بنیاد ہے اور اسی سے زندگی کی تمام مشکلات کا حل نکلتا ہے۔ جبکہ فکر کے لیے طریقے کا ہونا اس لیے لازمی اور ضروری ہے کہ وہ نظام، جو عقیدے سے نکلتا ہے، اگر اس میں مشکلات کے حل کی تنفیذ، عقیدے کی حفاظت اور دعوت کو پیش کرنے کی کیفیت شامل نہ ہو، تو یہ محض ایک فرضی اور خیالی فلسفہ بن کر رہ جائے گا، جو کتابوں کے اندر تو موجود ہو گا، لیکن زندگی کے میدان میں اس کا کوئی کردار اور اثر نہیں ہو گا۔ چنانچہ آئیڈیالوجی کے اندر عقیدے کا ہونا لازمی ہے اور اس کے ساتھ ساتھ مسائل کے حل کے لیے اس میں ایک طریقے کا موجود ہونا بھی ناگزیر ہے۔ تاہم ایک آئیڈیالوجی جس کے عقیدے سے نظام پیدا ہوتا ہے، اس میں صرف فکر اور طریقہ کا پایا جانا اس امر کی دلیل نہیں کہ وہ آئیڈیالوجی لازماً صحیح آئیڈیالوجی ہے۔ بلکہ اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ وہ آئیڈیالوجی ہو سکتی ہے، اس کا اور کوئی مطلب نہیں۔ جہاں تک آئیڈیالوجی کے صحیح یا باطل ہونے کا تعلق ہے، تو اس کا دارومدار عقیدہ پر ہوتا ہے۔ جو چیز کسی آئیڈیالوجی کے صحیح یا غلط ہونے پر دلالت کرتی ہے وہ اس آئیڈیالوجی کا عقیدہ ہے کیونکہ عقیدہ ہی وہ فکری اصول ہے، جو تمام افکار کی بنیاد ہوتا ہے، اس کے ذریعے تمام نقطہ ہائے نظر کا تعین ہوتا ہے اور اسی سے ہر مسئلے کا حل اور طریقہ پھوٹتا ہے۔ پس اگر یہ فکری اصول (یعنی عقیدہ) درست ہو تو وہ آئیڈیالوجی درست آئیڈیالوجی ہوتی ہے اور اگر یہ فکری قاعدہ غلط ہو تو وہ آئیڈیالوجی بھی غلط ہوتی ہے۔ اگر یہ فکری اصول انسان کی فطرت کے موافق ہو اور عقل پر مبنی ہو تو یہ درست اصول ہو گا۔ اور اگر یہ اصول انسانی فطرت کے مخالف ہو اور اس کی بنیاد عقلی نہ ہو تو یہ غلط اصول ہو گا۔

اس قاعدے کا انسانی فطرت کے موافق ہونے کا مطلب یہ ہے کہ یہ قاعدہ انسانی فطرت میں پائے جانے والی 'جبلتِ تدین' کے ساتھ موافقت رکھتا ہو۔ یعنی یہ عقیدہ انسان کی عاجزی کو اور انسان کے ایک خالقِ مدبر کی طرف رجوع کرنے کی کیفیت کو پہچانتا ہو۔ اس کے عقل پر مبنی ہونے کا مطلب یہ ہے کہ وہ مبنی برمادہ یا مبنی بر 'حلِ وسط' نہ ہو۔

اس وقت جب ہم پوری دنیا پر نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں صرف تین مبادی (آئیڈیالوجیز) نظر آتے ہیں۔ سرمایہ داریت، اشتراکیت، جس میں کمیونزم بھی شامل ہے، اور اسلام۔ پہلی دونوں آئیڈیالوجیز کی حامل کوئی ایک یا ایک سے زائد مملکتیں دنیا میں موجود ہیں۔ لیکن تیسری آئیڈیالوجی کی حامل کوئی مملکت اس وقت کرہ ارض پر موجود نہیں۔ البتہ مختلف اقوام کے اندر اس کے حامل اور عَلَم بردار افراد موجود ہیں۔ چنانچہ اس انداز میں یہ آئیڈیالوجی پورے کرہ ارض پر موجود ہے۔

جہاں تک سرمایہ داریت کا تعلق ہے، تو یہ دین کے زندگی سے جدا ہونے کی بنیاد پر قائم ہے۔ یہی فکر اس کا عقیدہ ہے اور یہی اس کی فکری قیادت اور فکری قاعدہ ہے۔ اس فکری قاعدے کے مطابق زندگی کے لیے نظام وضع کرنا صرف انسان کا کام ہے اور اس کی رُو سے انسان کے لیے لازم ہے کہ وہ آزادیوں (Freedoms) کی حفاظت کرے۔ اور وہ آزادیاں یہ ہیں: آزادیٔ عقیدہ، آزادیٔ رائے، آزادیٔ ملکیت اور شخصی آزادی۔ چنانچہ آزادیٔ ملکیت ہی سے سرمایہ دارانہ اقتصادی نظام وجود میں آیا۔ اس آئیڈیالوجی کی نمایاں ترین چیز صرف اور صرف سرمایہ داریت ہے، اور یہی وہ نمایاں ترین چیز ہے جو اس آئیڈیالوجی کے عقیدہ سے جنم لیتی ہے۔ چنانچہ اس اصول کے تحت کہ ''کسی چیز کا نام اس کی نمایاں ترین جڑ یا حصے کی مناسبت سے رکھا جاتا ہے'' اس آئیڈیالوجی کا نام سرمایہ داریت رکھا گیا۔

جہاں تک جمہوریت کی بات ہے، جسے اس آئیڈیالوجی نے اختیار کر رکھا ہے، تو یہ اِس آئیڈیالوجی کے اُس پہلو سے پیدا ہوتی ہے کہ انسان کو خود اپنے لیے نظام وضع کرنے کا حق ہے، چنانچہ عوام ہی طاقت کا سرچشمہ ہیں۔ وہی اپنی حکومت چلانے کے لیے تنخواہ دار حاکم مقرر کرتے ہیں اور جب چاہتے ہیں اُن سے حکومت چھین لیتے ہیں۔ عوام اپنے لیے جس طرح کا قانون چاہتے ہیں، اُن سے نافذ کرواتے ہیں۔ کیونکہ حکمرانی کرنا عوام اور حاکم کے مابین ایک طرح کا

'عقدِ ملازمت' ہوتا ہے۔ اس لیے حاکم صرف اُس نظام کے مطابق حکومت کرتا ہے، جسے عوام اس کے لیے وضع کرتے ہیں۔

جمہوریت اگرچہ اس آئیڈیالوجی سے ہے، لیکن وہ اس آئیڈیالوجی میں اقتصادی نظام سے زیادہ نمایاں نہیں۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ مغرب میں سرمایہ دارانہ نظام ہی حکمرانی پر اثرانداز ہوتا ہے۔ اس حد تک کہ ان ممالک میں، جہاں سرمایہ دارانہ آئیڈیالوجی کو اختیار کیا گیا ہے، وہاں حقیقی حاکم سرمایہ دار ہی ہیں۔ علاوہ ازیں جمہوریت اس آئیڈیالوجی کے ساتھ خاص بھی نہیں۔ کیونکہ اشتراکی بھی جمہوریت کے دعویٰ دار ہیں، اور وہ بھی یہ کہہ کر دھوکا دیتے ہیں کہ حکمرانی عوام کے لیے ہے۔ چنانچہ اس آئیڈیالوجی کو سرمایہ دارانہ آئیڈیالوجی کہنا ہی درست ہے۔

اس آئیڈیالوجی کا آغاز وہاں سے ہوا، جب یورپ اور روس کے بادشاہ اور فرمانروا عوام کا استحصال کرنے، اُن پر ظلم ڈھانے اور اُن کا خون چوسنے کے لیے دین کو ذریعہ کے طور پر استعمال کرتے تھے۔ اس کام کے لیے وہ مذہبی لوگوں کو آلۂ کار کے طور پر استعمال کیا کرتے تھے۔ جس کے نتیجے میں ایک خوفناک کشمکش اور تصادم برپا ہو گیا۔ جس کے دوران ایسے فلاسفر اور مفکر پیدا ہوئے، جنہوں نے سرے سے دین کا ہی انکار کر دیا۔ ان میں سے کچھ لوگ اگرچہ دین کا اعتراف کرتے تھے، لیکن وہ دین کو دنیاوی امور سے الگ کرنے کے قائل تھے۔ یہاں تک کہ اکثر فلاسفر اور مفکرین اس رائے پر متفق ہو گئے کہ دین کو دنیاوی امور سے الگ کر دیا جانا چاہیے۔ اس کا طبعی نتیجہ یہ نکلا کہ دین کو ریاست سے بھی الگ کر دیئے جانے کا نقطہ نظر پیدا ہو گیا۔ ان کے نزدیک یہ رائے پختہ ہو گئی کہ مذہب کے اعتراف یا اس کے انکار کی بحث میں پڑنا ہی نہیں چاہیے اور بات صرف اس نقطہ تک محدود ہو گئی کہ دین کو زندگی سے جدا کر دینا بہر حال ضروری ہے۔ پھر یہ فکر، اُن دینی لوگوں، جو ہر چیز کو دین کے نام پر اپنے ماتحت رکھنا چاہتے تھے، اور اُن فلاسفر اور مفکرین، جو دین اور دینی لوگوں کے غلبہ و حکومت کے منکر تھے، کے مابین ایک حلِ وسط (سمجھوتہ) قرار پائی۔ اس طرح اِس بعد میں آنے والے گروہ نے مذہب کے انکار پر اصرار کرنا چھوڑ دیا۔ لیکن یہ طے کرا دیا کہ زندگی میں اس کا

کوئی عمل دخل نہیں ہوگا۔ چنانچہ اس طرح آخر کار مذہب کو زندگی سے جدا کر دیا گیا۔ پس وہ عقیدہ، جسے تمام مغرب نے قبول کر رکھا ہے، وہ یہی دین کا دنیا سے جدا ہونے کا عقیدہ ہے۔ یہی عقیدہ وہ فکری بنیاد ہے، جس پر اس کے تمام افکار قائم ہیں۔ یہی عقیدہ اس بنیاد کا تعین کرتا ہے جس پر انسان کی فکری سمت استوار ہوتی ہے اور معاشرے اور زندگی کے بارے میں انسان کے نقطۂ نظر کا تعیّن ہوتا ہے اور اسی بنیاد پر زندگی کی تمام مشکلات حل کی جاتی ہیں۔ یہی وہ فکری قیادت ہے، جس کا مغرب علمبردار ہے اور اسی کی طرف وہ پوری دنیا کو دعوت دے رہا ہے۔

زندگی کے میدان سے دین کے الگ ہونے کے عقیدے میں ضمنی طور پر یہ اعتراف پایا جاتا ہے کہ دین نامی کوئی چیز موجود ہے۔ یعنی کائنات، حیات، انسان کے خالق اور قیامت کے دن کا وجود ہے۔ کیونکہ بحیثیتِ دین یہی دین کی بنیاد ہے۔ یہ اعتراف ہی اس کائنات، انسان، حیات کے دنیاوی زندگی سے قبل اور بعد سے تعلق کو ایک فکر کی شکل دیتا ہے۔ سرمایہ دارانہ فکری قیادت دین کے وجود کا انکار نہیں کرتی، بلکہ جب وہ دین کو دنیاوی امور سے الگ کرنے کی بات کرتی ہے تو یہ دین کا ضمنی طور پر اعتراف کرتی ہے، تاہم جب وہ دین کے وجود کا اثبات کرتی ہے، تو وہ اس کے ساتھ یہ فکر بھی دیتی ہے کہ دنیاوی زندگی کا اپنے سے قبل اور بعد کے ساتھ کوئی تعلق نہیں۔ دین پر مشتمل زندگی کا بھی دنیا سے کوئی تعلق نہیں، بلکہ دین صرف فرد اور اس کے خالق کے درمیان تعلق ہے۔ چنانچہ یہ ''دنیاوی امور سے دین کی جدائی'' کا عقیدہ، اپنے جامع مفہوم کے ساتھ کائنات، حیات اور انسان کے بارے میں ایک ہمہ گیر کُلی فکر بن گیا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ سرمایہ دارانہ آئیڈیالوجی، جس طور پر کہ ہم نے اسے بیان کیا، دوسری آئیڈیالوجیز کی طرح ایک مستقل آئیڈیالوجی ہے۔

جہاں تک اشتراکیت کا تعلق ہے، جس سے کمیونزم بھی پیدا ہوا، تو اس کا نظریہ ہے کہ کائنات انسان اور حیات صرف مادہ ہے، اور مادہ ہی تمام اشیاء کی بنیاد ہے۔ اسی کے ارتقاء سے اشیاء وجود میں آتی ہیں۔ مادہ کے علاوہ کوئی دوسری چیز ہے ہی نہیں۔ یہی مادہ ازلی اور قدیم ہے، کسی نے اس کو وجود نہیں بخشا یعنی مادہ ہی واجب الوجود ہے۔ یعنی یہ

کسی کی مخلوق نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اشتراکی اس بات کا انکار کرتے ہیں کہ اشیاء کسی خالق کی مخلوق ہیں۔ دوسرے لفظوں میں وہ اشیاء کے روحانی پہلو کا انکار کرتے ہیں۔ بلکہ وہ اس کے اعتراف کو زندگی کے لیے ایک خطرہ سمجھتے ہیں۔ چنانچہ وہ دین کو اقوام کے لیے افیون قرار دیتے ہیں، جو انہیں مدہوش کر کے عمل سے روکتا ہے۔ ان کے نزدیک مادے کے سواء کسی دوسری چیز کا کوئی وجود نہیں۔ حتیٰ کہ وہ فکر کو بھی دماغ پر مادے کا انعکاس قرار دیتے ہیں۔ اسی بنیاد پر وہ مادہ کو 'اصل الفکر' کہتے ہیں۔ ان کے نزدیک مادہ ہی اشیاء کی اصل (بنیاد) ہے، جس کے ارتقاء سے اشیاء وجود پذیر ہوتی ہیں۔ اسی بنیاد پر وہ خالق کے وجود کا انکار کرتے ہیں اور مادہ کو ازلی خیال کرتے ہیں۔ چنانچہ وہ ماقبل از حیات اور مابعد از حیات کا انکار کرتے ہیں اور صرف دنیاوی زندگی پر یقین رکھتے ہیں۔ باوجود یہ کہ دونوں آئیڈیالوجیز انسان، کائنات اور حیات کے بارے میں بنیادی اختلافات رکھتی ہیں، لیکن وہ اس بات پر متفق ہیں کہ انسان کے لیے بلند و برتر اقدار کے پیمانے وضع کرنا انسان کا اپنا کام ہے، اور یہ کہ خوشی یہ ہے کہ جسمانی لذتوں کو زیادہ سے زیادہ پورا کیا جائے۔ یہی خوشی حاصل کرنے کا ذریعہ ہے بلکہ خوشی بذاتِ خود اسی چیز کا نام ہے۔ یہ دونوں اس بات پر بھی متفق ہیں کہ انسان کو شخصی آزادی دینی چاہیے، تاکہ انسان جس چیز میں اپنی سعادت سمجھے، اسے اپنی خواہش اور ارادے کے مطابق جیسے چاہے استعمال کرے۔ یہی وجہ ہے کہ ذاتی طرزِ عمل یا شخصی آزادی کو ان دونوں آئیڈیالوجیز میں مقدس گردانا گیا ہے۔

دونوں آئیڈیالوجیز فرد اور معاشرے کے متعلق نقطۂ نظر میں اختلاف رکھتی ہیں۔ چنانچہ سرمایہ داریت انفرادیت کا نظریہ پیش کرتی ہے۔ اس کا خیال ہے کہ معاشرہ افراد سے مل کر بنتا ہے۔ یہ معاشرے کو ثانوی درجہ اور اصل اہمیت فرد کو دیتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ فرد کی آزادیوں کی حفاظت کو لازم قرار دیتی ہے۔ اس کے نتیجے کے طور پر اس آئیڈیالوجی میں، جس طرح عقیدہ کی آزادی مقدس ہے، اسی طرح اقتصادی آزادی بھی مقدس ہے۔ اس فلسفہ کی رُو سے فرد پر کسی قسم کی پابندی نہیں ہونی چاہیے۔ اگرچہ آزادیوں کی ضمانت مہیا کرنے کے لیے ریاست کی جانب سے فرد پر بعض پابندیاں عائد کی جاتی ہیں، اور ان پابندیوں کو ریاست سپاہی کی قوت اور قانون کے زور پر نافذ

کرتی ہے، لیکن اس کے نزدیک ریاست کی حیثیت ایک ذریعے کی سی ہے، نہ کہ غایت اور مقصود کی۔ کیونکہ اقتدارِ اعلیٰ بالآخر افراد کے پاس ہوتا ہے اور ریاست اس کی مالک نہیں ہوتی۔ لہٰذا سرمایہ داریت جس فکری قیادت کی علمبردار ہے، وہ دین کا دنیاوی زندگی سے علیٰحدہ کیا جانا ہے۔ اس فکری قیادت کو بنیاد بناتے ہوئے سرمایہ داریت اپنے نظاموں کو نافذ کرتی ہے، اسی کی طرف وہ دعوت دیتی ہے اور اسی کو وہ ہر جگہ نافذ کرنا چاہتی ہے۔

اشتراکیت، کہ جس میں کمیونزم بھی شامل ہے، کی رائے یہ ہے کہ معاشرہ ایک ایسا عمومی مجموعہ ہے، جو انسانوں اور ان کے فطرت کے ساتھ تعلقات پر مشتمل ہے۔ یہ تعلقات حتمی اور متعیّن ہوتے ہیں، اور ان کے سامنے انسانوں کو حتمی اور میکانکی انداز میں جھکنا پڑتا ہے۔ یہ سب کا سب مجموعہ (فطرت، انسان اور تعلقات) ایک ہی اکائی سے ہے، اور یہ ایک مجموعہ ہے کہ جس کے اجزاء ایک دوسرے سے الگ الگ نہیں ہیں۔ فطرت انسان کی شخصیت کا ایک حصہ ہے جسے انسان اپنی ذات میں اٹھائے ہوئے ہے۔ اس لیے انسان جب بھی ترقی کرتا ہے تو وہ اپنی شخصیت کے اس پہلو یعنی فطرت سے چمٹا ہوا ہوتا ہے۔ کیونکہ فطرت کے ساتھ انسان کا تعلق ایسے ہی ہے جیسے کسی شے کا اپنے آپ کے ساتھ تعلق۔ چنانچہ پورے معاشرے کو ایک مجموعۂ واحد گردانا جاتا ہے، جس کے تمام پہلو ایک ساتھ ترقی کرتے ہیں۔ فرد معاشرے کے تابع ہو کر اس طرح گردش کرتا ہے، جس طرح پہیے کی تار پہیے کے ساتھ گردش کرتی ہے۔ اس لیے ان کے نزدیک فرد کے لیے عقیدے کی آزادی یا اقتصادی آزادی کا کوئی وجود نہیں۔ کیونکہ عقیدہ بھی ریاست کے ارادے میں مقید ہے اور اقتصاد بھی۔ اس لیے اس آئیڈیالوجی میں ریاست کو مقدس سمجھا جاتا ہے۔ اس مادی فلسفہ سے نظام ہائے حیات پھوٹتے ہیں، اور اقتصادی نظام کو تمام نظاموں کی اساس قرار دیا جاتا ہے اور تمام نظام ہائے حیات کے لیے اسے ''مظہر عام'' تصور کیا جاتا ہے۔ لہٰذا وہ اشتراکی آئیڈیالوجی کہ جس میں کمیونزم بھی ہے، جس فکری قیادت کا حامل ہے، وہ مادیت اور مادی ترقی وارتقاء ہی ہے۔ اس مادیت کی اساس پر وہ اپنے نظام ہائے حیات کے مطابق حکومت کرتا ہے، اسی کی طرف وہ دعوت دیتا ہے اور اسی کو ہر جگہ نافذ کرنے کے لیے کوشاں ہے۔

اسلام کا جہاں تک تعلق ہے، تو وہ بتاتا ہے کہ اس کائنات، حیات اور انسان کے پیچھے ایک خالق ہے اور اُسی نے اِن تمام چیزوں کو پیدا کیا ہے۔ وہ اللہ تعالیٰ ہے۔ اس لیے اسلام کی بنیاد اور اساس اللہ تعالیٰ کے وجود پر یقین رکھنا ہے۔ یہی عقیدہ اشیاء کے روحانی پہلو کا تعین کرتا ہے۔ روحانی پہلو سے مراد صرف یہ ہے کہ انسان، حیات اور کائنات ایک خالق کی مخلوق ہیں۔ کائنات کا اپنے مخلوق ہونے کے ناطے خالق کے ساتھ تعلق، کائنات کا روحانی پہلو ہے۔ اسی طرح حیات کا اپنے خالق کے ساتھ تعلق اس کا روحانی پہلو ہے۔ اور اسی طرح انسان کا خالق کے ساتھ تعلق انسان کا روحانی پہلو ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ روح سے مراد انسان کا اپنے خالق کے ساتھ پائے جانے والے اس تعلق کا ادراک کرنا ہے۔

اللہ پر ایمان کے ساتھ ساتھ محمدا کی نبوت و رسالت اور قرآن کے کلام اللہ ہونے پر ایمان بھی واجب ہے۔ پس ہر اُس چیز پر ایمان لانا واجب ہے، جسے قرآن نے بیان کیا ہے۔ چنانچہ اسلام کا عقیدہ اس امر کا تقاضا کرتا ہے کہ حیات سے قبل کسی ایسی ذات کا پایا جانا ضروری ہے جس پر ایمان لانا واجب ہے اور وہ اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔ اس طرح دنیاوی زندگی کے بعد پر ایمان بھی ضروری ہے اور وہ قیامت کا دن ہے۔ یہ اس امر کا تقاضا بھی کرتا ہے کہ انسان اس دنیاوی زندگی میں اللہ تعالیٰ کے اوامر و نواہی میں مقید ہے۔ یہی اس حیاتِ دنیا کا اپنے ماقبل سے تعلق ہے۔ اسی طرح انسان کا محاسبہ اوامر کو پورا کرنے یا نہ کرنے اور نواہی سے اجتناب کرنے یا نہ کرنے کے حوالے سے کیا جائے گا اور یہی دنیاوی زندگی کا اپنے مابعد کے ساتھ تعلق ہے۔ اس لیے مسلمان کے لیے ضروری ہے کہ وہ کسی بھی عمل کو سرانجام دیتے وقت اللہ تعالیٰ کے ساتھ اپنے اس ربط و تعلق کا ادراک کرے۔ تاکہ اس کے اعمال اللہ تعالیٰ کے اوامر و نواہی کے مطابق ہوں۔ چنانچہ مادہ کے ساتھ روح کے امتزاج کا یہی معنی ہے کہ اعمال کو اللہ تعالیٰ کے اوامر و نواہی کے مطابق بجا لایا جائے۔ اعمال کی اصل غایت و مقصود اللہ تعالیٰ کی رضا کا حصول ہے اور اعمال کی بجاآوری کے دوران اس کا فوری مقصد وہ قیمت ہے، جو اس عمل کے نتیجے میں حاصل ہوتی ہے۔

اس لیے معاشرہ کی حفاظت کے لیے بلند مقاصد، انسان کے اپنے وضع کردہ نہیں ہونے چاہئیں۔ بلکہ یہ اللہ تعالیٰ کے اوامر و نواہی کی رُو سے متعین ہونے چاہئیں، جو ہمیشہ یکساں رہتے ہیں، نہ تبدیل ہوتے ہیں اور نہ ان کی تاویل ہو سکتی ہے۔ پس نوعِ انسان، عقلِ انسانی، انسانی شرافت، ذاتِ انسانی، انفرادی ملکیت، دین، امن وامان اور ریاست معاشرے کی حفاظت کے لیے بلند مقاصد ہیں۔ ان میں تغیر اور ارتقاء نہیں ہوتا۔ پھر ان بلند مقاصد کی حفاظت کی خاطر اسلام نے سخت قسم کی سزائیں رکھی گئی ہیں اور ان دائمی مقاصد کی حفاظت کے لیے حدود اور عقوبات وضع کیے گئے ہیں۔ ان بلند مقاصد کی حفاظت واجب ہے کیونکہ یہ اللہ تعالیٰ کے اوامر و نواہی ہیں۔ یہ حفاظت اس لیے واجب قرار نہیں دی گئی کہ ان سے مادی قیمت حاصل ہوتی ہے۔ اس طرح مسلمان اور ریاست اپنے تمام اعمال کو اللہ تعالیٰ کے اوامر و نواہی کے مطابق بجالاتے ہیں۔ کیونکہ یہ اللہ تعالیٰ کے اوامر و نواہی ہی ہیں، جن کے ذریعے انسان کے تمام معاملات منظم ہونے چاہئیں۔ اعمال کو اللہ تعالیٰ کے اوامر و نواہی کے مطابق بجالانا ہی دراصل وہ چیز ہے، جو مسلمانوں کے اندر اطمینان پیدا کرتی ہے۔ پس معلوم ہوا کہ انسان کی سعادت اس میں نہیں کہ انسانی جسم کو خوب سیر کیا جائے اور جسمانی لذتوں کو پورا کیا جائے، بلکہ انسانی سعادت اللہ تعالیٰ کی رضا میں ہے۔

جہاں تک جسمانی ضروریات اور جبلتوں کا تعلق ہے، تو اسلام نے انہیں اس انداز میں منظم کیا ہے کہ اس تنظیم میں ہر قسم کی حاجات، مثلاً معدے کی بھوک، جبلتِ نوع کی حاجت اور روح کی حاجت کو پورا کرنے کی ضمانت دی ہے۔ اسلام نے یہ تنظیم اس طرح نہیں کی کہ ایک بھوک یا حاجت کو پورا کرنے کے لیے دوسری کو قربان کر دیا ہو، یا کچھ کو آزاد چھوڑ کر باقی سب کو دبا دیا ہو، یا سب کو بے لگام چھوڑ دیا ہو۔ بلکہ اسلام نے بڑے دقیق نظام کے ذریعے ان سب کو اس طرح سیر کیا ہے اور ان میں نظم و نسق پیدا کیا ہے، جو انسان کے لیے خوشگواری اور راحت مہیا کرتا ہے۔ وہ انسان کی جبلتوں کو لگام دے کر، انسان کو حیوانیت کے کھڈ میں گرنے سے روکتا ہے۔

اس تنظیم کی ضمانت دینے کے لیے اسلام جماعت کو اس نظر سے دیکھتا ہے کہ یہ ایک ایسا کل ہے، جس کے اجزاء ایک دوسرے سے الگ الگ نہیں ہوتے۔ اس طرح اسلام فرد کو اس نظر سے دیکھتا ہے کہ فرد جماعت کا ایسا جزو ہوتا ہے جو کبھی بھی اس سے جدا نہیں ہوتا۔ لیکن فرد کے جماعت کا جزو ہونے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اسکی یہ جزویت ایسی ہے، جیسا کہ پہیے کی تار پہیئے کا ایک جزو ہوا کرتی ہے۔ بلکہ وہ اپنے کل کا اس طرح جزو ہوتا ہے جس طرح کہ ہاتھ اپنے جسم کا جزو ہوتا ہے۔ چنانچہ اسلام نے فرد کی نگرانی اس حوالے سے کی ہے کہ یہ جماعت کا ایک جزو ہے، اور اس سے الگ تھلگ نہیں۔ اور وہ اس حیثیت سے فرد پر توجہ دیتا ہے کہ جماعت کی حفاظت ہو سکے۔ اسی وقت اسلام جماعت کی نگرانی بھی کرتا ہے اور وہ اسے توجہ و عنایت کا موضوع اس حیثیت سے نہیں بناتا کہ یہ ایک کل ہے جس کے اجزاء نہیں ہیں، بلکہ اسلام اسے ایک ایسا کل سمجھتا ہے، جو اپنے اجزاء یعنی افراد پر مشتمل ہے۔ اس عنایت اور توجہ کے نتیجے میں، جماعت کا جزو ہونے کی حیثیت سے، افراد کی بھی خود بخود حفاظت ہو جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((مَثَلُ الْقَاءِمِ عَلٰی حُدُوْدِ اللهِ وَالْوَاقِعِ فِيْهَا كَمَثَلِ قَوْمٍ اِسْتَهَمُوْا عَلٰى سَفِيْنَةٍ فَاَصَابَ بَعْضُهُمْ اَعْلَاهَا وَ بَعْضُهُمْ اَسْفَلَهَا فَكَانَ الَّذِيْنَ فِيْ اَسفَلِهَا اِذَاسْتَسْقَوْا مِنَ الْمَاءِ مَرُّوْا عَلٰى مَنْ فَوْقِهِمْ فَقَالُوْا: لَوْ أَنَّاخَرَقْنَا فِيْ نَصِيْبِنَا خَرْقًا وَ لَمْ نُؤْذِ مَنْ فَوْقَنَا۔ فَإِنْ تَرَكُوْاهُمْ وَ مَا اَرَادُوْا هَلَكُوْا جَمِيْعًا۔ وَإِنْ أَخَذُوْا عَلٰى أَيْدِيْهِمْ نَجَوْا وَ نَجَوْا جَمِيْعًا))

”حدود اللہ کو قائم کرنے والے اور ان کی خلاف ورزی کرنے والوں کی مثال اس گروہ کی سی ہے، جس نے کشتی میں جگہ کے لیے قرعہ اندازی کی۔ پس اس میں سے کچھ افراد تو کشتی کے اوپر والے حصہ میں چلے جائیں اور کچھ نیچے رہ جائیں۔ سو جو لوگ نچلے حصے میں ہوں، جب وہ اپنی پیاس بجھانے کے لیے اوپر والوں کے پاس پانی لینے کے لیے جائیں اور ان (اوپر والوں) سے کہیں کہ اگر ہم نچلے حصے میں سوراخ کر لیں تو آپ بھی تکلیف سے بچ جائیں گے۔ اب اگر اوپر

والے انہیں اس سے باز نہ رکھیں اور آزاد چھوڑ دیں، تو نیچے والے اور اوپر والے دونوں ہلاک ہو جائیں گے۔ اور اگر وہ نیچے والوں کو روکیں گے تو دونوں نجات پائیں گے۔''

فرد اور جماعت کا یہ نقطۂ نظر معاشرے کے بارے میں ایک مخصوص تصور وجود میں لاتا ہے۔ ایک جماعت کے اجزاء ہونے کے ناطے افراد کے لیے ضروری ہے کہ ان کے پاس افکار ہوں، جو انہیں باہم مربوط رکھیں اور وہ ان افکار کے مطابق زندگی گزاریں۔ اسی طرح یہ بھی ضروری ہے کہ ان سب کے ایک جیسے احساسات وجذبات ہوں، جن سے وہ متاثر بھی ہوں اور ان کی طرف میلان بھی رکھیں۔ اسی طرح ان سب پر ایک ہی نظام نافذ ہو، جو ان کی زندگی کے تمام مسائل حل کرے۔ اس لیے معلوم ہوا کہ معاشرہ افراد، انسانی افکار واحساسات اور نظام پر مشتمل ہوتا ہے اور انسان اپنی زندگی میں ان افکار، احساسات اور نظام میں مقید ہوتا ہے۔ لہٰذا ایک مسلمان اپنی زندگی میں ہر لحاظ سے اسلام کے ساتھ مربوط ہے اور اس کے لیے اس میں کوئی آزادی نہیں۔ چنانچہ مسلمان کا عقیدہ اسلام کی حدود کے اندر مقید ہے اور وہ کسی بھی طریقے سے آزاد نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مسلمان کے لیے مرتد ہونا بہت بڑا جرم ہے۔ اور اگر وہ توبہ نہ کرے تو سزا کا مستحق ہوتا ہے۔ اسی طرح ایک مسلمان کا شخصی پہلو بھی اسلام کے نظام میں مقید ہوتا ہے۔ اسی لیے زنا کو ایک بہت بڑا جرم سمجھا جاتا ہے، جس کی سزا عوام کے سامنے کسی قسم کی نرمی یا شفقت کے بغیر ملتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

(وَلْيَشْهَدْ عَذَابَهُمَا طَائِفَةٌ مِّنَ الْمُؤْمِنِيْنَ)

''اور ان دونوں (زانی اور زانیہ) کو سزا دیتے وقت مسلمانوں کی ایک جماعت موجود ہونی چاہیے'' (النور: 2)

اسی طرح شراب خوری ایک جرم ہے، جس کی سزا ملے گی۔ دوسروں پر ظلم وزیادتی کو بھی جرم قرار دیا گیا ہے۔ اس ظلم وزیادتی کی اپنے اعتبار سے مختلف سزائیں ہیں، مثلاً قذف، قتل وغیرہ۔ اسی طرح اقتصادی پہلو بھی شرعی احکامات میں مقید ہے اور اس کے اسباب صرف وہی ہو سکتے ہیں، جنہیں شرع نے مباح قرار دیا ہو اور جن کی تعریف شریعت میں

انفرادی ملکیت کی ہے۔ در حقیقت انفرادی ملکیت بھی شارع کی طرف سے وہ اجازت ہے، جو اس نے کسی چیز سے نفع اٹھانے کے لیے دی ہے۔ چنانچہ شریعت کی ان حدود و قیود سے نکلنا جرم ہے، جس کی مختلف صورتیں اور اقسام ہو سکتی ہیں، مثلاً چوری، غصب وغیرہ۔ لہٰذا ایک ایسی ریاست کا پایا جانا انتہائی ضروری ہے جو اس جماعت اور فرد کی حفاظت کر سکے، اور جماعت پر نظام کو نافذ اور منطبق کر سکے۔ اور یہ بھی ضروری ہے کہ اس آئیڈیالوجی کے ماننے والوں کے اندر آئیڈیالوجی کے اثرات بھی پائے جاتے ہوں، تاکہ حفاظتی عمل لوگوں کی جانب سے طبعی طور پر انجام پا سکے۔ اس لیے آئیڈیالوجی ہی وہ چیز ہے جو معاشرے کو پابند اور محفوظ رکھتی ہے، جبکہ ریاست ان احکامات کو نافذ کرتی ہے، جو اس آئیڈیالوجی سے ماخوذ ہوتے ہیں۔ معلوم ہوا کہ سیادت (اقتدارِ اعلیٰ) شریعت کو حاصل ہے، نہ کہ ریاست اور امت کو۔ اگرچہ قوت و طاقت امت کے پاس ہی ہوتی ہے، اور ریاست اس کا مظہر ہوتی ہے۔ پس اسلام کے نظام کو نافذ کرنے کا طریقہ ریاست ہے۔ اگرچہ اس کا اصل اعتماد بھی اللہ کے خوف پر ہوتا ہے، جو اُس فردِ مومن میں پایا جاتا ہے، جو اسلام کے احکام کو بجالاتا ہے۔ مزید برآں اس کے لیے وہ قانون بھی ناگزیر ہے، جسے ریاست نافذ کرے۔ اور مومن فرد کو ہدایت و رہنمائی ملے تاکہ وہ تقویٰ کے جذبے کے تحت اسلام پر چل سکے۔

اسلام ایک عقیدہ بھی ہے اور نظام ہائے حیات بھی۔ اسلام ایک ایسی آئیڈیالوجی ہے جو فکر ہبھی ہے اور طریقہ بھی ہے، جو فکرہ کی جنس سے ہی ہے۔ اسلام کا نظام اسلام کے عقیدے سے جنم لیتا ہے۔ اس طرح اس کی تہذیب بھی ایک مخصوص طرزِ حیات پر مبنی ہے۔

اسلام میں دعوت کو آگے پیش کرنے کا طریقہ کار یہ ہے کہ اسلام کو ریاست کی جانب سے نافذ کیا جائے، اور پھر اسلام کو فکری قیادت کے طور پر دنیا کے سامنے پیش کیا جائے، جو اسلام کو سمجھنے اور اس پر عمل کرنے کی بنیاد بنے۔ لوگوں پر حکومت کے ذریعے سے اسلام کو نافذ کرنا ہی اسلام کی دعوت کو پیش کرنا ہے۔ کیونکہ غیر مسلموں پر اسلام کے

نظام کی تنفیذ ہی کو اسلام کی دعوت کا عملی طریقہ گردانا جاتا ہے، اور اس تنفیذ کا اس عالمِ اسلامی کو پیدا کرنے میں بہت بڑا اثر ہے، جو آج دُور دُور تک پھیلا ہوا ہے۔

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ دنیا میں تین مبادی موجود ہیں۔ سرمایہ داریت، اشتراکیت، اور اسلام۔ ان میں سے ہر آئیڈیالوجی کا اپنا عقیدہ ہے، جس سے نظام جنم لیتا ہے۔ ہر ایک کے پاس زندگی میں انسانی اعمال کو جانچنے کے لیے ایک معیار ہے اور ہر ایک کا معاشرے کے بارے میں ایک خاص نقطۂ نظر اور نظام کو نافذ کرنے کا ایک خاص طریقہ ہے۔

جہاں تک عقیدہ کی بات ہے تو اشتراکی مبدأ کی رائے یہ ہے کہ مادہ ہی تمام اشیاء کی اصل ہے اور تمام اشیاء مادی ارتقاء کے ذریعے ہی وجود میں آتی ہیں، یعنی 'ڈایا لیکٹیکل میٹیریل ازم" کے ذریعے۔ سرمایہ دارانہ مبداء کا نظریہ یہ ہے کہ دین کا دنیا سے جدا ہونا ضروری ہے۔ چنانچہ نتیجے کے طور پر دین ریاست سے بھی جدا ہو جاتا ہے۔ لہٰذا سرمایہ داریت کے حامل اس بحث میں پڑنا ہی نہیں چاہتے کہ کوئی خالق ہے یا نہیں؟ البتہ وہ یہ ضرور کہتے ہیں کہ خالق کا زندگی میں کوئی عمل دخل نہیں ہونا چاہیے۔ چنانچہ خالق کے وجود کا اعتراف اور انکار ان کے لیے برابر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے عقیدے کی رُو سے خالق کا معترف اور اس کا منکر دونوں برابر ہیں، اور یہی دین کو دنیا سے جدا کر دینے کا عقیدہ ہے۔

اسلام کا عقیدہ یہ ہے کہ اللہ ہی تمام موجودات کا خالق ہے، اور اسی نے بنی نوع انسان کے لیے اپنے انبیاء اور رسولوں کو اپنے دین کے ساتھ مبعوث فرمایا ہے۔ وہی قیامت کے دن انسان سے اس کے اعمال کا حساب کتاب لے گا۔ چنانچہ اسلام کا عقیدہ اللہ پر ایمان، فرشتوں پر ایمان، کتابوں پر ایمان، رسولوں پر ایمان، یومِ آخرت پر ایمان اور قضا و قدر کے خیر و شر کے من جانب اللہ ہونے پر مشتمل ہے۔

اب رہا سوال کہ عقیدہ سے نظام کس طرح پھوٹتا ہے؟ تو کمیونزم کی رائے ہے کہ نظام ذرائع پیداوار سے ماخوذ ہے۔ کیونکہ جاگیردارانہ معاشرے میں کلہاڑا پیداوار کا ذریعہ تھا اور اسی سے جاگیرداری نظام ماخوذ ہوا۔ چنانچہ جب اس

قسم کا معاشرہ سرمایہ داریت کی طرف ترقی کرتا ہے تو مشینری ذریعۂ پیداوار بن جاتی ہے۔ لہٰذا اس سے سرمایہ دارانہ نظام اخذ ہوتا ہے، کیونکہ نظام مادی ارتقاء کے ذریعے وجود میں آتا ہے۔ سرمایہ دارانہ آئیڈیالوجی کی رائے ہے کہ جب انسان نے دین کو دنیاوی امور سے الگ کر دیا، تو اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ اس حیات ہی سے اپنے لیے بذاتِ خود نظام وضع کرے۔ چنانچہ اس طرح انسان نے حقیقت سے اپنا نظام خود وضع کرنا شروع کر دیا۔ لیکن اسلام کی رائے یہ ہے کہ نظام اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہونا چاہیے اور اللہ تعالیٰ نے سیدنا محمدؐ کو اس نظام کے ساتھ مبعوث فرمایا ہے اور آپ نے اسے انسان تک پہنچا دیا ہے۔ اب انسان پر لازم ہے کہ وہ اس نظام پر چلے۔ مسلمان کو چاہیے کہ وہ پہلے اپنی مشکلات کو سمجھے، پھر کتاب و سنت سے ان مشکلات کا حل نکالے۔

زندگی میں اعمال کے لیے معیار کا جہاں تک تعلق ہے، تو کمیونزم کی رائے یہ ہے کہ مادیت یعنی مادی نظام ہی اعمال کی کسوٹی ہے، اور مادہ کے ارتقاء سے یہ معیار ترقی بھی کرتا ہے۔ سرمایہ دارانہ آئیڈیالوجی کی رائے یہ ہے کہ زندگی میں اعمال کا معیار منفعت ہے۔ اعمال کو جانچنا اور اعمال کو سرانجام دینا منفعت کی کسوٹی کی بنیاد پر ہوگا۔ اسلام کہتا ہے کہ زندگی میں اعمال کا معیار حلال و حرام یعنی اللہ تعالیٰ کے اوامر و نواہی ہیں۔ پس حلال کام کو کیا جائے گا اور حرام کام سے اجتناب کیا جائے گا۔ یہ معیار نہ تو ترقی کرتا ہے اور نہ ہی تبدیل ہوتا ہے اور نہ اس پر منفعت اثر انداز ہوتی ہے۔ چنانچہ حاکمیت صرف شریعت کو حاصل ہے۔

جہاں تک معاشرے کے متعلق نقطۂ نظر کا تعلق ہے، تو کمیونزم کی رائے ہے کہ معاشرہ ایک عمومی مجموعہ ہے۔ اس میں زمین، ذرائع پیداوار، فطرت اور انسان تمام کے تمام مادہ ہونے کے اعتبار سے 'شے واحد' ہیں۔ اور جب فطرت، اور جو کچھ اس میں ہے، ترقی کرتے ہیں، تو ان کے ساتھ انسان بھی ترقی کرتا ہے۔ چنانچہ پورا معاشرہ بھی ترقی کرتا ہے۔ لہٰذا معاشرہ مادی ترقی کے تابع ہے۔ انسان کا کام صرف اتنا ہے کہ وہ تناقضات (اختلافات) کو پیدا کرتا رہے،

تاکہ یہ ترقی تیز تر ہو سکے۔ پھر جب معاشرہ ترقی کرتا ہے تو فرد بھی اس کے ساتھ ترقی کرتا ہے۔ یعنی وہ معاشرے کے ساتھ اس طرح گردش کرتا ہے، جیسے پہیے کی تار پہیے کے ساتھ گردش کرتی ہے۔

اس کے بارے میں سرمایہ دارانہ آئیڈیالوجی کی رائے یہ ہے کہ معاشرہ صرف افراد سے مل کر بنتا ہے۔ اس لیے جب ہر فرد کے امور منظم ہو جاتے ہیں تو معاشرہ کے امور بھی منظم ہو جاتے ہیں۔ اس لیے صرف فرد پر نظر رکھنے کی ضرورت ہے، اور حکومت صرف فرد ہی کے لیے کام کرتی ہے۔ اس لیے یہ انفرادیت کی آئیڈیالوجی ہے۔ جبکہ اسلام کہتا ہے کہ جس اساس پر معاشرہ قائم ہوتا ہے، وہ اساس عقیدہ اور اس سے نکلنے والے افکار، احساسات اور نظام ہے۔ پس اسلامی معاشرہ تب وجود میں آتا ہے جب اسلام کے افکار اور احساسات وجذبات غالب ہوں اور اسلام کا نظام لوگوں پر نافذ ہو۔ معاشرہ افراد، افکار، احساسات وجذبات اور نظام کے مجموعہ کو کہتے ہیں۔ لہٰذا ایک انسان دوسرے انسان کے ساتھ مل کر جماعت تو بنا سکتا ہے، لیکن ایک معاشرہ کا وجود لوگوں میں ایک ہی قسم کے افکار واحساسات اور ایک ہی قسم کے نظام کے بغیر نہیں ہوتا، جو ان پر نافذ ہو۔ وہ چیز، جو انسانوں کے مابین تعلقات پیدا کرتی ہے، وہ مشترکہ مصلحت ہے۔ اگر اس مصلحت پر افکار متحد ہو جائیں، اور یوں اس پر احساسات بھی متحد ہو جائیں، تو رضامندی اور ناراضی بھی متحد ہو جائیں گے۔ اسی طرح وہ نظام جو مشکلات کو حل کرتا ہے، وہ بھی اگر ایک ہو، تو انسانوں کے درمیان تعلقات پیدا ہو جاتے ہیں۔ لیکن اگر مصلحت کے متعلق افکار مختلف ہو جائیں، یا احساسات مختلف ہوں، تو رضامندی اور ناراضی بھی ایک نہیں ہوں گے۔ اور جب وہ نظام مختلف ہو، جو انسانوں کے معاملات و مسائل کو حل کرتا ہے تو لوگوں کے مابین تعلق پیدا نہیں ہو گا، نتیجتاً معاشرہ قائم نہیں ہو گا۔ لہٰذا معاشرہ افراد، افکار، احساسات وجذبات اور نظام پر مشتمل ہے کیونکہ یہی چیزیں تعلقات کو جنم دیتی ہیں اور لوگوں کے گروہ کو ایک مخصوص معاشرہ بناتی ہیں۔

اس لیے اگر کسی معاشرہ کے تمام لوگ مسلمان ہوں، لیکن وہ سرمایہ دارانہ اور جمہوری افکار کے حامل اور علمبردار ہوں،ان کے جذبات پاپائیت نمار وحانیت یا وطن پرستی کے ہوں،اور اُن پر نافذ نظام سرمایہ دارانہ جمہوریت ہو، تو وہ معاشرہ ایک غیر اسلامی معاشرہ ہے،اگرچہ اس کے بیشتر افراد مسلمان ہی کیوں نہ ہوں۔

جہاں تک نظام کو نافذ کرنے کا تعلق ہے، تو کمیونزم کی رائے ہے کہ ریاست ہی نظام کو پولیس اور سخت قوانین کے زور پر نافذ کرنے کی مجاز ہے۔افراد اور معاشرے کے مسائل اور معاملات کی بھی وہی ذمہ دار ہے اور نظام کی ترقی بھی ریاست ہی کے ذریعے سے ہوتی ہے۔ جبکہ سرمایہ داریت کے نزدیک حکومت کا کام آزادیوں کی نگرانی ہے۔ پس کوئی شخص کسی دوسرے شخص کی آزادی میں دست درازی کرے تو اسے منع کیا جائے گا۔ کیونکہ ریاست کا وجود ہی آزادیوں کی ضمانت کے لیے ہے۔تاہم اگر کوئی شخص دوسرے کی آزادی سلب کیے بغیر اس کا استحصال کرے، اور اس کے حقوق چھین لے، لیکن یہ سب کچھ اس کی رضامندی سے ہو، تو اسے آزادی پر دست درازی نہیں کہا جائے گا اور ریاست اس معاملے میں مداخلت نہیں کرے گی۔ کیونکہ ریاست کا وجود صرف آزادیوں کی ضمانت کی فراہمی کے لیے ہے۔

لیکن اسلام کی رائے ہے کہ نظام مومن کے تقویٰ کے بل بُوتے پر نافذ ہوتا ہے اور ریاست نظام کو معاشرے میں اسلام کی عدالت اور انصاف پسندی کے شعور،امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے لیے حکمران کے ساتھ امت کے تعاون اور اپنی قوت کے ذریعے نافذ کرتی ہے۔ ریاست جماعت کے امور کی نگرانی کرتی ہے۔ یہ فرد کے امور کی نگرانی صرف اس وقت کرتی ہے، جب وہ فرد خود ان کی نگرانی اور حفاظت سے عاجز ہو۔ یہ نظام کبھی ارتقاء نہیں کرتا۔ ریاست کو احکام شریعت کی تبنّی کا اختیار حاصل ہے، جب کسی معاملے کے متعلق اجتہاد کے متعدد نتیجے نکلتے ہوں۔

اسلام کی آئیڈیالوجی کی فکری قیادت انسانی فطرت کے ساتھ مکمل ہم آہنگ ہے۔ یہ اپنے اندر گہرائی رکھنے کے باوجود سمجھنے میں سہل اور آسان ہے۔انسان کے دل ودماغ اسے تیزی سے قبول کرتے ہیں،انسان اس کا فہم حاصل

کرنے کی طرف راغب ہوتا ہے اور اس کی باریکیوں کو سمجھنے کی کوشش کرتا ہے۔ کیونکہ جبلتِ تدیُّن انسان کا ایک حصہ ہے اور ہر انسان فطری اعتبار سے متدیّن ہے۔ کوئی بھی قوت اس فطرت کو ختم کرنے کی طاقت نہیں رکھتی۔ کیونکہ اس کی جڑیں انسان کے اندر نہایت گہری ہیں۔ انسان طبعی طور پر یہ محسوس کرتا ہے کہ وہ ناقص ہے، اور اس سے بڑی کوئی قوت ہے، جو تقدیس کی مستحق ہے۔ تدین انسان کی وہ حاجت ہے، جو وہ اپنے خالقِ مدبر کے لیے محسوس کرتا ہے۔ اور جو انسان کی ذات کے اندر پائے جانے والے عجز سے پیدا ہوتی ہے۔ یہ جبلتِ تدین ایک مستقل چیز ہے، اور اس کا مخصوص اظہار تقدس ہے۔ اس لیے انسان ہر زمانے میں متدین رہا ہے اور کسی نہ کسی چیز کی عبادت کرتا رہا ہے۔ انسان خود انسان کی، آسمانوں کی، پتھروں کی، حیوانات اور آگ وغیرہ کی پرستش کرتا رہا ہے۔ اسلام اپنے عقیدے کے ساتھ اس لیے ظہور پذیر ہوا کہ وہ انسان کو مخلوقات کی عبادت سے نکال کر ایک اللہ کی عبادت کی طرف لے جائے، جس نے ہر شے کو پیدا کیا ہے۔ جب اس مادی آئیڈیالوجی کا ظہور ہوا، جو اللہ تعالیٰ اور روح کی منکر ہے، تو وہ بھی انسان میں موجود اس فطری تدین کو ختم نہ کر سکی۔ بلکہ اس نے انسان کے اندر اپنی سے بڑی قوت کے تصور اور تقدس کو اپنی آئیڈیالوجی کے حاملین کی قوت کے تقدس کی طرف منتقل کر دیا۔ گویا اس طرح وہ پیچھے کی طرف لوٹ گئی، اور انسان میں پائے جانے والے اس جذبۂ تقدس کو اللہ تعالیٰ کی عبادت کی طرف سے بندوں کی عبادت کی طرف پھیر دیا۔ اسے اللہ کی آیات کے تقدس سے پھیر کر مخلوق کے کلام کے تقدس کی راہ پر ڈال دیا۔ اس طرح یہ نظریہ ایک قسم کا رجعت پسندانہ نظریہ ہے۔ جب یہ نظریہ فطرتِ تدین کو ختم نہ کر سکا تو اسے رجعت پسندانہ طور پر ایک سمت میں موڑ دیا۔ اس لیے اس آئیڈیالوجی کی فکری قیادت انسانی فطرت کے خلاف ہے، اور ایک سلبی نوعیت کی قیادت ہے۔ یہ انسان کو صرف معدے کے گرد گھماتی ہے اور صرف بھوکوں، خوفزدہ لوگوں اور مایوس افراد کو اپنی لپیٹ میں لیتی ہے۔ صرف پست ہمت افراد، زندگی میں پیچھے رہ جانے والے اور دوسروں کو حسد و رقابت سے دیکھنے والے عقل کے کورے انسان ہی اس مادی نظریہ کو اختیار کرتے ہیں۔ تاکہ جب وہ ڈایالیکٹیکل نظریہ کے متعلق گفت و شنید کریں، جس کا عقل و حس کی رُو سے باطل اور فاسد ہونا ثابت ہو چکا ہے، تو انہیں اربابِ فکر میں سے مان لیا جائے۔ اس لیے یہ نظریہ اپنی آئیڈیالوجی

کے سامنے لوگوں کو جھکانے کے لیے قوت و طاقت کا سہارا لیتا ہے۔ چنانچہ شورش، پریشانی، تباہی، ظلم اور ہنگامے اس کے اہم ترین وسائل ہیں۔

اسی طرح سرمایہ داریت کی فکری قیادت بھی انسان کی جبلتِ تدین کی مخالف ہے۔ کیونکہ جبلتِ تدین کا اظہار، جس طرح تقدس میں ہوتا ہے، اسی طرح زندگی میں انسانی اعمال کی تدبیر و تنظیم میں بھی ہوتا ہے۔ جب انسان یہ تدبیر و تنظیم کرتا ہے تو اس میں تناقض و اختلاف پیدا ہو جاتا ہے، یہ انسان کی عاجزی اور کمزوری کی علامت ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ صرف دین ہی زندگی میں انسان کے تمام اعمال کی تدبیر کرے۔ دین کو دنیاوی امور سے الگ کر دینا فطرتِ انسانی کے خلاف ہے۔ زندگی میں دین کے وجود کے ہر گز یہ معنی نہیں کہ زندگی کے اعمال کو عبادت قرار دے دیا جائے۔ بلکہ زندگی میں دین کے وجود کے معنی یہ ہیں کہ وہ نظام نافذ کیا جائے، جس کا اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے اور اس کے ذریعے زندگی کی تمام مشکلات کو حل کیا جائے۔ یہ نظام اس عقیدہ سے پھوٹتا ہو جو انسان کی جبلتِ تدین کے موافق ہو۔ اس نظام کو ہٹا کر اس نظام کو اُس عقیدہ سے اخذ کرنا، جو دنیاوی امور سے دین کی جدائی کی فکر پر قائم ہو اور جبلتِ تدین کے موافق نہ ہو، انسانی فطرت کے خلاف ہے۔ اس لیے سرمایہ دارانہ نظام کی فکری قیادت فطرت کے پہلو کے اعتبار سے انتہائی پست اور مایوس کن ہے۔ کیونکہ یہ ایک سلبی قیادت ہے، کیونکہ یہ دین کو زندگی سے جدا کرتی ہے، جبلتِ تدیُّن کو زندگی سے دور کرتی ہے، دین کو انسان کا انفرادی مسئلہ بنا دیتی ہے اور اس نظام کو دور کر دیتی ہے، جس کے مطابق انسانی مشکلات کو حل کرنے کا اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے۔

اسلام کی فکری قیادت ایک مثبت قیادت ہے۔ کیونکہ یہ اللہ تعالیٰ کے وجود پر ایمان لانے کے لیے عقل کو اساس بناتی ہے اور اس کے لیے انسانی نظر کو کائنات، انسان اور حیات کی طرف متوجہ کرتی ہے۔ لہٰذا انسان تمام مخلوقات کے لیے ایک خالق کے موجود ہونے پر قطعی یقین کرتے ہوئے مطمئن ہو جاتا ہے۔ یہ قیادت انسان کے لیے اس مطلق اور کامل ذات کا تعین کر دیتی ہے جس کا وہ فطری طور پر متلاشی ہوتا ہے، اور جسے وہ نہ انسان میں پاتا ہے، نہ

کائنات میں اور نہ ہی حیات میں۔ یہ قیادت اُس ذات کی طرف انسانی عقل کی رہنمائی کرتی ہے، اور انسانی عقل اس کے وجود کا ادراک کرنے کے بعد اس پر ایمان لاتی ہے۔

کمیونزم کی فکری قیادت کی بنیاد عقل نہیں، بلکہ اس کی بنیاد مادہ ہے، اگرچہ انسانی عقل ہی اس تک پہنچی ہے۔ کیونکہ اس کا کہنا ہے کہ مادہ پہلے ہے اور فکر بعد میں۔ یہی وجہ ہے کہ یہ مادے کو تمام اشیاء کا اصل قرار دیتی ہے۔ اس لیے یہ ایک مادی فکر ہے۔ سرمایہ داریت کی فکری قیادت درمیانی حل (سمجھوتے) پر مبنی ہے، جو کلیسا کے مذہبی طبقے اور مفکرین کے درمیان صدیوں تک جاری زبردست کشمکش کے نتیجے میں پیدا ہوا۔ اور آخر کار دین ریاست سے جدا ہو گیا۔

اس سے معلوم ہوا کہ یہ دونوں فکری قیادتیں یعنی کمیونزم اور سرمایہ داریت انتہائی پست ہیں۔ کیونکہ یہ دونوں انسانی فطرت سے متناقض (متضاد) ہیں اور ان کی بنیاد عقل نہیں ہے۔

حاصلِ کلام یہ ہے کہ صرف اسلام کی فکری قیادت ہی صحیح فکری قیادت ہے، اور اسکے علاوہ جو بھی فکری قیادتیں ہیں، وہ فاسد ہیں۔ اس لیے کہ اسلام کی فکری قیادت مبنی بر عقل ہے، جبکہ دوسری فکری قیادتیں مبنی بر عقل نہیں۔ اسلام کی فکری قیادت فطرتِ انسانی کے ساتھ ہم آہنگ اور متفق ہے اور دوسری فکری قیادتیں فطرتِ انسانی کے مخالف ہیں۔ اس کی تفصیل یہ ہے: کمیونزم کی فکری قیادت مبنی بر عقل نہیں، بلکہ مبنی بر مادہ ہے۔ کیونکہ یہ کہتی ہے کہ مادہ، فکر یعنی عقل سے مقدم ہے۔ جب مادہ دماغ پر منعکس ہوتا ہے تو فکر وجود میں آتی ہے۔ تو پھر دماغ اس مادے کے بارے میں غور و فکر کرتا ہے، جو اس پر منعکس ہو چکا ہوتا ہے۔ اور دماغ پر مادے کے انعکاس سے قبل کوئی فکر نہیں پائی جاتی، اس لیے ہر چیز مادہ پر مبنی ہے۔ پس کمیونزم کی فکری قیادت کی بنیاد مادہ ہے، فکر نہیں۔

لیکن یہ نظریہ دو وجوہات کی بنا پر غلط ہے: پہلی وجہ یہ ہے کہ مادہ اور دماغ کے درمیان کوئی انعکاس نہیں پایا جاتا۔ لہٰذا نہ تو دماغ مادہ پر منعکس ہوتا ہے اور نہ مادہ دماغ پر۔ کیونکہ جس چیز پر عکس بن رہا ہو، اس کے اندر انعکاس کو قبول کرنے کی صلاحیت کا پایا جانا لازم ہے، جیسا کہ آئینہ۔ لیکن دماغ اور مادہ میں اس قسم کی کوئی صفت نہیں پائی جاتی، پس نہ

مادہ دماغ پر منعکس ہوتا ہے اور نہ ہی اس کی طرف منتقل ہوتا ہے، بلکہ مادے کا احساس حواس کے ذریعے دماغ کی طرف منتقل ہوتا ہے۔ یہ مادے کا دماغ پر انعکاس نہیں اور نہ دماغ کا مادے پر انعکاس ہے، بلکہ یہ تو مادے کا صرف احساس ہے اور اس لحاظ سے آنکھ اور دوسرے حواس کے مابین قطعاً کوئی فرق نہیں۔ پس جس طرح چھونے، سونگھنے، چکھنے اور سننے سے احساس ہوتا ہے، اسی طرح دیکھنے سے بھی ہوتا ہے۔ معلوم ہوا کہ جو کچھ اشیاء کے بارے میں دماغ میں آتا ہے، وہ دماغ پر ان اشیاء کا انعکاس نہیں، بلکہ وہ اشیاء کے بارے میں صرف احساس ہوتا ہے۔ چنانچہ انسان حواسِ خمسہ کے ذریعے اشیاء کو محسوس کرتا ہے نہ کہ اشیاء دماغ پر منعکس ہوتی ہیں۔

اس نظریے کے غلط ہونے کی دوسری وجہ یہ ہے کہ صرف حواس سے فکر حاصل نہیں ہو سکتی، بلکہ ان سے صرف احساس ہوتا ہے، یعنی کسی حقیقت کا احساس۔ کسی احساس کو خواہ کروڑ گنا بڑھا دیا جائے، اس سے صرف حقیقت کا احساس ہی حاصل ہو گا، فکر کسی صورت حاصل نہیں ہو گی۔ فکر کے لیے انسان کے پاس سابقہ معلومات ہونی چاہئیں، تاکہ ان کے ذریعے وہ ان واقعات کی توجیہہ کر سکے، جنہیں وہ محسوس کرتا ہے اور اس طرح اسے فکر حاصل ہو سکے۔ ہم کسی انسان کو پکڑ کر اسے سُریانی کتاب دے دیں اور اسے سریانی زبان کے بارے میں کچھ معلوم نہ ہو، اور ہم اس سے کہیں کہ وہ اپنے حواس کو اس کتاب پر ڈالے، اسے دیکھے اور چھوئے۔ وہ ایک کروڑ دفعہ بھی اپنے حواس اس پر ڈالے، اس کو دیکھے اور چھوئے، تب بھی وہ ایک لفظ بھی نہیں سمجھ سکے گا۔ جب تک کہ ہم اسے سریانی زبان اور اس کے متعلق دیگر معلومات مہیا نہ کر دیں۔ جب ہم اسے متعلقہ معلومات بہم پہنچائیں گے، تو پھر وہ فکر اور ادراک کرنے لگے گا۔ اسی طرح اگر ہم ایک ایسے بچے کو لیتے ہیں جس کے پاس حواس تو پائے جاتے ہوں لیکن سابقہ معلومات کچھ بھی نہ ہوں۔ اور ہم اسکے سامنے سونے، پیتل اور پتھر کا ایک ایک ٹکڑا رکھ دیں اور کہیں کہ وہ اپنے تمام حواس ان اشیاء پر ڈالے۔ اس کے لیے ان اشیاء کا ادراک پھر بھی ممکن نہیں ہو گا۔ خواہ وہ انہیں کتنی ہی بار دیکھے اور دیکھنے کی نوعیت کچھ بھی ہو۔ البتہ جب ہم اسے ان کے بارے میں معلومات دے دیں گے، تو وہ محسوس کرے گا اور ان معلومات کو بروئے

کارلاتے ہوئے ان کاادراک کرلے گا۔ لیکن اس بچے کو اگر یہ معلومات نہ دی جائیں اور اس کی عمر بڑھ کر بیس سال بھی ہو جائے، تب بھی وہ پہلے دن جیسا ہی رہے گا، خواہ اس کا دماغ کتنا ہی بڑا کیوں نہ ہو جائے۔ وہ ان کا ادراک نہیں کر سکے گا۔ کیونکہ ادراک صرف دماغ کے ذریعے نہیں ہوتا، بلکہ اس کے ساتھ سابقہ معلومات اور واقعہ کا احساس ہونا لازمی ہے۔

یہ ادراک عقل سے متعلق تھا، اور جہاں تک جبلی طرزِ عمل کا تعلق ہے تو یہ جبلتوں اور جسمانی حاجات کی پیداوار ہے۔ یہ طرزِ عمل انسان اور حیوان دونوں میں پایا جاتا ہے۔ بچہ بھی سیب اور پتھر بار بار دینے سے پہچانتا ہے کہ سیب کھایا جاتا ہے اور پتھر کو نہیں کھایا جاتا۔ گدھا بھی جَو کھاتا ہے اور مٹی نہیں کھاتا۔ اس تمیز کو فکر نہیں کہا جاتا اور یہ ادراک بھی نہیں ہے۔ بلکہ یہ تو جبلتوں اور جسمانی حاجات کا ردِ عمل ہے۔ اس میں انسان اور حیوان سب برابر ہیں۔ معلوم ہوا کہ فکر اس وقت تک حاصل نہیں ہوتی جب تک حقیقت کے احساس کو دماغ کی طرف منتقل کر کے اسے سابقہ معلومات سے نہ جوڑا جائے۔

گویا عقل، فکر یا ادراک سے مراد ہے، کسی حقیقت کے احساس کا حواس کے ذریعے دماغ کی طرف منتقل ہونا، اور سابقہ معلومات کا پایا جانا، جن کے ذریعہ سے اس حقیقت کی توجیہہ کی جا سکے۔ چنانچہ کمیونزم کی فکری قیادت غلط اور فاسد ہے۔ کیونکہ یہ مبنی بر عقل نہیں۔ علاوہ ازیں انہوں نے فکر اور عقل کے جو معنی پیش کیے ہیں وہ بھی فاسد ہیں۔

اسی طرح سرمایہ دارانہ فکری قیادت، کلیسا کے مذہبی طبقے اور مفکرین کے درمیان سمجھوتے (درمیانی حل) کی بنیاد پر قائم ہے۔ کیونکہ کلیسا اور مفکرین ایک طویل اور زبردست کشمکش کے بعد اس درمیانی حل پر پہنچے کہ دین دنیاوی امور سے الگ ہے۔ گویا کہ اس میں دین کا ضمنی طور پر اعتراف موجود ہے، لیکن اسے زندگی سے الگ کیا گیا ہے۔ لہٰذا یہ فکری قیادت مبنی بر عقل نہیں، بلکہ صرف باہمی رضامندی کے حل یا درمیانی حل پر مبنی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم

دیکھتے ہیں کہ سمجھوتے کے تصور کی جڑیں ان کے اندر بہت گہری ہیں۔ یہ لوگ درمیانی حل کے ذریعے حق اور باطل کو، ایمان اور کفر کو اور روشنی و تاریکی کو ایک دوسرے کے قریب لانا چاہتے ہیں۔ حالانکہ ان حقائق کے درمیان سمجھوتہ ہو ہی نہیں سکتا۔ کیونکہ کوئی معاملہ یا حق ہوگا یا باطل، یا ایمان ہوگا یا کفر، یا نور ہوگا یا ظلمت۔ لیکن وہ درمیانی حل جس کی بنیاد پر ان کا عقیدہ اور ان کی فکری قیادت قائم ہے، اس نے انہیں حق، ایمان اور نور سے بہت دور کر دیا ہے۔ لہٰذا ان کی فکری قیادت، مبنی بر عقل نہ ہونے کی وجہ سے فاسد اور غلط ہے۔

اسلام کی فکری قیادت مبنی بر عقل ہے۔ یہ مسلمان کے لیے اللہ، محمد ا اور قرآنِ کریم پر عقلی طریقے سے ایمان لانے کو فرض قرار دیتی ہے۔ اسی طرح وہ غیب سے متعلقہ امور پر ایمان کو بھی فرض قرار دیتی ہے، جب وہ ایک ایسی چیز میں بیان کیے گئے ہوں جس کا وجود عقل سے ثابت ہے، یعنی قرآن یا متواتر احادیث۔ چنانچہ معلوم ہوا کہ یہ فکری قیادت مبنی بر عقل ہے۔

یہ گفتگو تو عقل کے حوالے سے تھی۔ جہاں تک فطرت کا تعلق ہے، تو اسلام کی فکری قیادت فطرت کے بھی عین مطابق ہے۔ کیونکہ یہ فکری قیادت دین کے وجود پر ایمان رکھتی ہے۔ اور زندگی میں دین کے لازمی طور پر پائے جانے کی وجہ سے، زندگی کو اللہ تعالیٰ کے اوامر اور نواہی کے مطابق چلانے پر ایمان رکھتی ہے۔ 'تدین' ایک فطری چیز ہے۔ کیونکہ یہ دوسری جبلّتوں کی طرح ایک جبلت ہے، اور اس کا اپنا ایک خاص اثر ہے، جسے تقدیس کہتے ہیں اور یہ دیگر جبلتوں کے اثر سے مختلف ہے۔ چنانچہ دین پر ایمان رکھنا اور انسانی اعمال کا اللہ تعالیٰ کے اوامر و نواہی کے مطابق ہونا ایک جبلّی (فطری) چیز ہے۔ پس یہ انسانی فطرت کے موافق اور اس سے ہم آہنگ ہے۔

جبکہ اس کے برخلاف دونوں فکری قیادتیں، یعنی کمیونزم اور سرمایہ داریت، انسانی فطرت کے بالکل مخالف ہیں۔ چونکہ کمیونزم کی فکری قیادت سرے سے ہی دین کے وجود کی منکر ہے، اور اس نے دین کے اعتراف کے خلاف ایک جنگ برپا کر دی، چنانچہ یہ فطرت کے بالکل مخالف ہے۔ سرمایہ دارانہ فکری قیادت دین کی معترف ہے اور نہ اس

کی منکر۔ وہ اس کے اعتراف یا انکار کو موضوعِ بحث بھی نہیں بناتی۔ البتہ وہ دین کے دنیاوی زندگی سے جدا ہونے کو ضروری سمجھتی ہے اور چاہتی ہے کہ زندگی کی گاڑی کو صرف منفعت (فائدے) کی بنیاد پر چلنا چاہیے، دین کا اس میں بالکل کوئی عمل دخل نہیں ہونا چاہیے۔ چنانچہ یہ فطرت کے ساتھ متناقض اور اس سے بہت دور ہے۔

اس تمام بحث سے معلوم ہو گیا کہ صرف اسلام کی فکری قیادت ہی ایک صالح فکری قیادت ہے۔ کیونکہ یہ انسانی فطرت اور انسانی عقل کے موافق ہے۔ اس کے علاوہ باقی تمام فکری قیادتیں باطل ہیں۔ پس صرف اسلام کی فکری قیادت ہی صحیح ترین اور کامیاب ترین فکری قیادت ہے۔

اب ایک سوال باقی ہے کہ کیا مسلمانوں نے کبھی اسلام کو عملاً نافذ بھی کیا؟ ایسا تو نہیں تھا کہ مسلمانوں نے اس عقیدے کو تو قبول کیا لیکن وہ اسلام کے سوا کوئی اور نظام اور قوانین نافذ کرتے رہے ہوں!؟ اس کا جواب یہ ہے کہ مسلمانوں نے رسول اللہ ﷺ کے مدینہ ہجرت کرنے سے لے کر 1336 ہجری بمطابق 1918 عیسوی میں استعمار کے ہاتھوں آخری اسلامی ریاست کے سقوط تک صرف اور صرف اسلام ہی کو نافذ کیے رکھا۔ یہ نفاذ اس قدر جامع اور ہمہ گیر تھا کہ اسلامی ریاست کو اس سلسلے میں انتہائی کامیابی حاصل ہوئی۔

جہاں تک مسلمانوں کے اسلام کو عملاً نافذ کرنے کا تعلق ہے، تو اسلام کو صرف ریاست ہی نافذ کر سکتی ہے۔ پھر ریاست میں اسلام کو نافذ کرنے والے دو اشخاص ہوتے ہیں: ایک قاضی، جو لوگوں کے درمیان فیصلے کرتا ہے، اور دوسرا حاکم، جو لوگوں پر حکمرانی کرتا ہے۔ جہاں تک قاضی کا تعلق ہے، تو یہ بات تواتر سے منقول ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے زمانے سے لے کر استنبول میں خلافت کے خاتمے تک، قاضی لوگوں کے درمیان تمام فیصلے شریعتِ مطہرہ کے مطابق کرتے رہے، خواہ وہ معاملات مسلمانوں کے مابین تھے، یا مسلمانوں اور کفار کے درمیان۔ وہ عدالتیں جو حقوق، جرائم، خاندانی معاملات سمیت تمام تنازعات کے متعلق فیصلے کرتی تھیں، صرف ایک ہی طرح کی عدالت ہوا کرتی تھیں، جو صرف شریعتِ اسلامی کی رُو سے فیصلے کیا کرتی تھی۔ اس بارے میں کوئی ایک روایت بھی نہیں کہ کسی

ایک مسئلہ کا بھی شریعت کے خلاف فیصلہ کیا گیا ہو۔ ایسی بھی کوئی روایت موجود نہیں کہ استعمار کے زیر اثر عدالتوں کے شرعی اور نظامی (سِول) عدالتوں میں تقسیم سے قبل، عالمِ اسلام میں پائی جانے والی کسی عدالت نے اسلام سے ہٹ کر کسی اور بنیاد پر کوئی فیصلہ دیا ہو۔ اس کی بہترین اور قوی ترین دلیل شرعی عدالتوں کا وہ ریکارڈ ہے، جو بیت المقدس، بغداد، دمشق، قاہرہ اور استنبول جیسے قدیم شہروں میں محفوظ ہے۔ یہ اس بات کی یقینی دلیل ہے کہ مسلمان قاضی صرف اور صرف اسلامی شریعت ہی کو نافذ کیا کرتے تھے۔ یہاں تک کہ اُس دور میں یہود و نصاریٰ نہ صرف اسلامی فقہ کو پڑھتے تھے بلکہ اس میں تصنیف و تالیف بھی کیا کرتے تھے۔ جیسا کہ سلیم الباز، جس نے المَجَلَّۃ کی شرح لکھی ہے۔ یہ اُن غیر مسلموں میں سے ہے، جنہوں نے آخری دور میں اسلامی فقہ میں تصنیف و تالیف کا کام کیا۔ جہاں تک اُن قوانین کا تعلق ہے، جنہیں خلافت کے انہدام کے نزدیک اسلامی ریاست میں داخل کیا گیا، تو اس کا جواب یہ ہے کہ ان قوانین کو علمائے اسلام کے فتوؤں کی بنیاد پر داخل کیا گیا کہ یہ اسلام کے احکامات کے مخالف نہیں ہیں۔ چنانچہ عثمانی پینل کوڈ (قانون الجزاء العثمانی) کو 1275 ہجری بمطابق 1857 عیسوی میں اور لاء آف رائٹس اینڈ ٹریڈ (قانونِ حقوق و تجارت) کو 1276 ہجری بمطابق 1858 عیسوی میں نافذ کرنے کے لیے اسلامی ریاست میں داخل کیا گیا۔ 1288 ہجری بمطابق 1870 عیسوی میں عدالتوں کو دو اقسام میں تقسیم کر دیا گیا: شرعی عدالتیں اور نظامی عدالتیں۔ پھر 1295 ہجری بمطابق 1877 عیسوی میں نظامی عدالتوں کی تشکیل کے لیے ایک لائحہ عمل تیار کیا گیا۔ جب علماء 'سِول لاء' کو ریاست میں داخل کر دینے کے حوالے سے کوئی جواز نہ پا سکے، تو 1286 ہجری میں اَلْمَجَلَّۃ کو لین دین کے معاملات کے لیے بطورِ قانون وضع کیا گیا اور سول لاء کو منسوخ کر دیا گیا۔ ان سب قوانین کو اس حیثیت سے وضع کیا گیا تھا کہ اسلام ان کی اجازت دیتا ہے۔ پھر ان قوانین پر اس وقت تک عمل درآمد نہیں کیا جا سکتا تھا، جب تک کہ ان کے لیے باقاعدہ فتویٰ نہ لیا گیا ہو اور شیخ الاسلام ان کی اجازت نہ دے دے۔ یہ حقیقت ان حکومتی فرامین سے پوری طرح واضح ہو جاتی ہے جو اس سلسلہ میں صادر کیے گئے تھے۔ اور اگرچہ استعمار نے اسلامی علاقوں پر قبضہ جما کر 1918ء سے اسلامی علاقوں میں لوگوں کے معاملات کے متعلق شریعتِ اسلامی کے برخلاف فیصلے دینے شروع کر دیے، لیکن وہ

مسلم ممالک جن میں استعمار اپنی فوجوں کے ذریعے براہِ راست داخل نہیں ہوا، اگرچہ اپنے اثر و نفوذ کے اعتبار سے وہاں بھی داخل ہو چکا ہے، میں عدالتی سطح پر آج بھی فیصلے اسلام ہی کے مطابق کیے جا رہے ہیں۔ پس جزیرۃ العرب، حجاز، نجد، کویت اور افغانستان جیسے مسلم ممالک میں عدالتی سطح پر آج 1383ھ بمطابق 1955ء تک اسلام ہی کو نافذ کیا جا رہا ہے اور عدالتی دائرہ میں صرف اسلامی شریعت کے مطابق ہی حکومت کی جا رہی ہے۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ اسلامی ریاست کے تمام ادوار میں عدالتی سطح پر اسلام ہی کو نافذ کیا گیا، اور کسی خلافِ اسلام حکم یا چیز کو نافذ نہیں کیا گیا۔

جہاں تک حکمران کی طرف سے اسلام کے نفاذ کا تعلق ہے تو یہ پانچ چیزوں پر مشتمل ہے: معاشرت، اقتصاد، تعلیم، خارجہ سیاست اور نظامِ حکمرانی سے متعلق احکامِ شریعت کا نفاذ۔ ان معاملات سے متعلق شرعی احکامات کو اسلامی ریاست کی طرف سے نافذ کیا جاتا ہے۔ معاشرتی نظام میں مرد اور عورت کے تعلقات اور ان تعلقات کے نتیجے میں جنم لینے والے امور یعنی شخصی احوال کا تعین کیا جاتا ہے۔ معاشرتی نظام میں استعمار اور کفریہ حکومت موجود ہونے کے باوجود اسلام کے احکامات کو ہی نافذ کیا جا رہا ہے اور اس کے علاوہ کسی اور قانون کو نافذ نہیں کیا گیا۔ جہاں تک اقتصادی نظام کا تعلق ہے، تو اس کے دو پہلو ہیں: اول: لوگوں کی مشکلات کو حل کرنے کے لیے ریاست کا عوام سے اموال حاصل کرنا۔ دوم: ان اموال کو خرچ کرنے کی کیفیت۔ جہاں تک اموال حاصل کرنے کی بات ہے تو اسلامی ریاست زمینوں اور مویشیوں پر زکوٰۃ کو بطورِ عبادت وصول کرتی ہے، اور اسے صرف اُن آٹھ اصناف پر خرچ کرتی ہے، جن کا قرآن میں ذکر ہوا ہے۔ ریاست زکوٰۃ کو حکومتی معاملات چلانے کے لیے استعمال نہیں کر سکتی۔ ریاست امت کے معاملات کو چلانے کے لیے اسلامی شریعت کے مطابق دیگر اموال اکٹھے کیا کرتی تھی۔ چنانچہ وہ زمینوں پر خراج لگاتی تھی اور اسے وصول کیا کرتی تھی۔ یا پھر غیر مسلموں سے جزیہ وصول کرتی تھی۔ خارجی اور داخلی تجارت پر نگران کی حیثیت سے کسٹم ٹیکسز حاصل کرتی تھی۔ بہر حال ریاست جو بھی اموال حاصل کرتی تھی، صرف اسلامی شریعت کی رُو سے حاصل کرتی تھی۔

جہاں تک اِن اموال کی تقسیم کا سوال ہے تو ریاست عاجز کے لیے نان ونفقہ کا بندوبست کرتی تھی، سفیہ (بے سمجھ) اور مبذّر (جو حرام پر مال خرچ کرے) پر حجر کا قانون نافذ کرتی تھی اور ان پر وصی (نگران) مقرر کرتی تھی۔ ہر شہر میں مسافروں اور حاجیوں کے لیے گزرگاہوں پر ایسی جگہیں قائم کی جاتیں، جہاں پر فقیروں، مسکینوں اور مسافروں کو کھانا اور رہائش مہیا کیے جاتے تھے۔ آج تک بڑے بڑے شہروں میں ان کے آثار موجود ہیں۔ حاصلِ کلام یہ ہے کہ ریاست کی جانب سے جو بھی مال صَرف ہوتا تھا، وہ شریعت کے خلاف نہیں، بلکہ شریعت کے عین مطابق ہوا کرتا تھا۔ اور اگر کوئی کمی نظر آتی ہے تو وہ شریعت کی غیر موجودگی کی وجہ سے نہیں بلکہ شریعت کے نفاذ میں کوتاہی کی وجہ سے تھی۔

جہاں تک تعلیم کا تعلق ہے، تو تعلیمی پالیسی کی بنیاد بھی اسلام پر رکھی گئی تھی اور اسلامی ثقافت ہی طریقۂ تعلیم کی اساس تھی۔ اسلام سے متناقض بیرونی ثقافت کو اختیار کرنے کا رجحان بالکل نہیں تھا۔ تعلیمی درسگاہیں کھولنے میں کوتاہی صرف عثمانی ریاست کے آخری دور میں تمام علاقوں میں نظر آتی ہے۔ اس کا سبب وہ فکری انحطاط تھا جو اس وقت اپنی انتہائی حدوں کو پہنچ چکا تھا۔ اس کے علاوہ باقی تمام ادوار کے بارے میں تو یہ بات بہت مشہور ہے کہ صرف اسلامی علاقے ہی علم و فضل رکھنے والوں اور طالب علموں کی آنکھوں کا تارا تھے۔ دنیا میں علم کو عام کرنے میں قرطبہ، بغداد، دمشق، اسکندریہ اور قاہرہ کی یونیورسٹیوں کا بہت بڑا کردار ہے۔

اسلامی ریاست کی خارجہ پالیسی بھی اسلام کی اساس پر استوار تھی۔ اسلامی ریاست دیگر ریاستوں کے ساتھ تمام تعلقات اسلام کی اساس پر قائم کرتی تھی اور دوسری ریاستیں بھی اس ریاست کو ایک اسلامی ریاست کی نظر سے دیکھتی تھیں۔ تمام تر خارجی تعلقات اسلام اور مسلمانوں کی مصلحت (فائدہ) کی بنیاد پر استوار تھے۔ اسلامی ریاست کی خارجہ پالیسی کا اسلامی ہونا پوری دنیا میں مشہور تھا، اور اس امر کے ثبوت کے لیے مزید کسی دلیل کی ضرورت نہیں۔

جہاں تک نظامِ حکمرانی کا تعلق ہے، تو اسلامی ریاست کا ڈھانچہ آٹھ ستونوں پر استوار ہوتا ہے: خلیفہ، جو کہ ریاست کا سربراہ ہوتا ہے، معاونِ تفویض اور معاونِ تنفیذ، والی، عدلیہ، امیرِ جہاد، انتظامی ڈھانچہ اور مجلسِ امت۔ یہ ڈھانچہ اسلامی ریاست میں موجود تھا، جب تک استعمار (کافر) نے 1342 ہجری بمطابق 1924ء میں مصطفیٰ کمال کے ذریعے خلافت کا خاتمہ نہیں کر دیا۔ اس سے قبل کسی دور میں بھی مسلمان بغیر خلیفہ کے نہیں رہے۔ جب ایک خلیفہ کی وفات ہو جاتی یا وہ معزول کر دیا جاتا تو اس کی جگہ دوسرا خلیفہ آجاتا، حتیٰ کہ آخری دور میں، جب انحطاط اپنے عروج پر تھا، تب بھی ایسا ہی ہوتا رہا۔ حقیقت یہ ہے کہ جب خلیفہ موجود ہو تو اسلامی ریاست بھی وجود میں آجاتی ہے۔ کیونکہ اسلامی ریاست دراصل خلیفہ کی موجودگی سے ہی عبارت ہے۔ جہاں تک معاونین کا تعلق ہے تو یہ بھی ہر دور میں موجود تھے، یہ حکمرانی اور احکامات کی تنفیذ کے لیے ہوتے ہیں اور یہ وزراء کی مانند نہیں ہوتے۔ اگرچہ عباسیوں کے عہد میں ان کے لیے وزراء کا لقب بھی استعمال کیا گیا لیکن یہ صرف معاونین ہوا کرتے ہیں اور جمہوری نظام میں وزراء کو جو خصوصیات حاصل ہوتی ہیں ان کے پاس ایسی خصوصیات نہیں ہوا کرتی تھیں۔ ان کا کام صرف حکمرانی میں معاونت اور احکامات کا نفاذ ہوتا ہے، اور خلیفہ انہیں یہ ذمہ داری تفویض کرتا ہے۔ جبکہ اختیارات صرف خلیفہ کے پاس ہوتے ہیں۔ جہاں تک والیوں، قاضیوں اور انتظامی ڈھانچے کا تعلق ہے، تو جب تک خلافت تھی تو یہ بھی اس کے ساتھ ہر دور میں موجود تھے جب استعماری قوتیں بلاد المسلمین میں داخل ہوئیں تو تمام امور کی دیکھ بھال کی جا رہی تھی اور ان علاقوں میں والی، قاضی اور انتظامی ڈھانچہ موجود تھا، اور یہ ایک ایسی حقیقت ہے جو کسی دلیل کی محتاج نہیں۔ جہاں تک امیرِ جہاد کا تعلق ہے، تو وہ فوج کے امور کو بحیثیت اسلامی فوج چلاتا تھا اور پوری دنیا اس حقیقت سے واقف تھی کہ اسلامی ریاست کی فوج ایک اسلامی فوج ہے اور یہ مغلوب نہیں ہوا کرتی۔ شوریٰ کا جہاں تک تعلق ہے، تو خلفائے راشدین کے بعد اس پر کوئی خاص توجہ نہیں دی گئی۔ اس کہ وجہ یہ تھی کہ مشورہ دینا اگرچہ ریاستی ڈھانچہ میں شامل ہے تاہم یہ اسلام کے نظامِ حکمرانی کے اصولوں میں سے کوئی اصول نہیں ہے۔ اور راعی پر رعیت کے جو حقوق عائد ہوتے ہیں، شوریٰ بھی ان میں سے ایک حق ہے، پس اگر کوئی راعی (خلیفہ) اس پر عمل نہ کرے تو یہ اس کی کوتاہی ضرور ہے تاہم اس کی حکومت

پھر بھی اسلامی حکومت ہی کہلائے گی، کیونکہ شوریٰ رائے حاصل کرنے کے لیے ہوتی ہے، نہ کہ حکمرانی کے لیے۔ یہ امر جمہوری نظام میں موجود مجلسِ نمائندگان سے بالکل مختلف ہے کیونکہ یہ مجلس عوام کے اقتدارِ اعلیٰ کی نمائندگی کرتی ہے اور یہ سرمایہ دارانہ آئیڈیالوجی کے نظامِ حکمرانی کا بنیادی اصول ہے جبکہ اسلام میں اقتدارِ اعلیٰ شریعت کو حاصل ہے۔ لہٰذا یہ بات واضح ہوگئی کہ اسلام کا نظامِ حکمرانی ہمیشہ نافذ رہا ہے۔

اور جہاں تک خلیفہ کی بیعت کا سوال ہے تو خلیفہ کی بیعت کے مسئلے میں یہ بات قطعی ہے کہ اس میں وراثتی نظام کا عمل دخل بالکل نہیں تھا۔ یعنی نظامِ وراثت ریاست کے اندر کوئی مستقل حکم نہیں تھا کہ جس کے ذریعے حکمرانی کو حاصل کیا جائے۔ یعنی یہ ریاست کی سربراہی حاصل کرنے کا ذریعہ نہیں تھا، جیسا کہ بادشاہی نظام میں ہوتا ہے۔ ریاست میں حکمرانی حاصل کرنے کے لیے جو چیز مستقل اور مقرر تھی، وہ بیعت تھی۔ یہ بیعت کچھ ادوار میں مسلمانوں سے لی جاتی تھی اور کچھ دور میں اربابِ حل وعقد سے اور دورِ زوال میں یہ صرف شیخ الاسلام سے لی جاتی تھی۔ بہرحال خلیفہ کو مقرر کرنے کا جو طریقہ اسلامی ریاست میں ہمیشہ سے رہا ہے وہ بیعت کا ہے۔ اس بارے میں کوئی ایک روایت بھی نہیں کہ بیعت کے بغیر صرف وراثت سے کبھی کوئی خلیفہ بنا ہو۔ ہاں ایسا ہوا کہ بیعت کو غلط انداز سے حاصل کیا گیا اور خلیفہ نے لوگوں سے اپنی ہی زندگی میں اپنے بیٹے، بھائی، یا چچا کے بیٹے یا اپنے خاندان کے کسی فرد کے لیے بیعت لے لی۔ لیکن خلیفہ کی موت کے بعد نئے خلیفہ کی بیعت کی تجدید جاتی تھی۔ یہ بیعت کے حکم کا بُرا نفاذ ہے لیکن اس کا ولی عہدی یا وراثت سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ ایسے ہی ہے جیسا کہ اگر جمہوریت میں انتخابی نظام کا غلط استعمال ہو تو اسے انتخابات ہی کہا جاتا ہے، نامزدگی نہیں کہا جاتا، خواہ اس میں وہی اشخاص کامیاب ہو جائیں جو حکومت چاہتی ہے۔ بہرحال اس تمام بحث سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے اور ہمیں یہ دیکھ سکتے ہیں کہ تمام ادوار میں اسلامی ریاست میں اسلامی نظام ہی نافذ رہا اور کسی بھی دور میں کسی غیر اسلامی چیز کو نافذ نہیں کیا گیا۔

جہاں تک اسلامی فکری قیادت کی عملی کامیابی کا تعلق ہے تو یہ کامیابی بے مثال ہے، خصوصاً دو پہلوؤں سے:

اول: اسلامی فکری قیادت نے پوری عرب قوم کو فکری انحطاط کی اس حالت سے، کہ وہ قبائلی عصبیت کے اندھیروں اور جاہلیت کی گھٹاٹوپ تاریکیوں میں ٹامک ٹوئیاں مار رہی تھی، نکال کر فکری نشاۃ ثانیہ کے راستہ پر لا کھڑا کیا۔ عرب قوم اُس نورِ اسلامی سے جگمگانے لگی کہ جس کے سورج کی روشنی صرف عربوں تک محدود نہ تھی بلکہ وہ پوری دنیا پر چھاگئی۔ اس کے بعد مسلمان پوری دنیا تک اسلامی دعوت کو پہنچانے کے لیے نکل کھڑے ہوئے۔ یہاں تک کہ مسلمان ایران، عراق، بلادِ شام، مصر اور شمالی افریقہ پر چھاگئے۔ ان ممالک کی اقوام اور ان کی زبانیں مختلف تھیں، فارسی رومیوں سے مختلف تھے، اسی طرح مصر کے قبطی شمالی افریقہ کی بربر قوم سے مختلف تھے، ان کی عادات وروایات، زبان، مذہب الغرض ہر چیز مختلف تھی، لیکن جونہی یہ حکمِ الٰہی کے سائے تلے آئے اور انہوں نے اسلام کو سمجھ لیا تو یہ سب امتِ واحدہ یعنی امتِ مسلمہ میں ڈھل گئے۔ اس لیے وہ کامیابی جو اسلامی فکری قیادت کو ان اقوام اور قبائل کو اپنے قالب میں ڈھالنے کے سلسلے میں حاصل ہوئی، وہ بے مثال ہے۔ حالانکہ اس کے پاس اپنی دعوت کو آگے پہنچانے کے لیے نقل وحمل کے وسائل میں سے صرف اونٹ اور گھوڑے، اور نشر واشاعت کے وسائل میں سے صرف زبان اور قلم موجود تھے۔

اور جہاں تک فتوحات کا تعلق ہے تو وہ قوت کو قوت سے زائل کرنے اور مادی رکاوٹوں کو دور کرنے کے لیے تھیں۔ تاکہ انسان خالی الذہن ہو کر اُس چیز تک رسائی حاصل کر سکے جس کی طرف اُس کی عقل اور فطرت رہنمائی کرتی ہیں۔ یوں لوگ جوق در جوق حلقۂ اسلام میں داخل ہو گئے۔ جہاں تک ظالمانہ فتوحات کا تعلق ہے تو ہمیں علم ہونا چاہیے کہ ایسی فتوحات تو فاتح و مفتوح اور غالب اور مغلوب کے مابین دُوری پیدا کرتی ہیں۔ ذرا اس مغربی استعمار پر نگاہ ڈالیں جس نے کئی دہائیوں تک مشرق کو اپنے چُنگل میں گرفتار کیے رکھا، لیکن دلوں کی تبدیلی کے لحاظ سے وہ ادنیٰ درجہ کی کامیابی بھی حاصل نہ کر سکا۔ اور اگر آج گمراہ کن ثقافت کا اثر و نفوذ اور مغربی ایجنٹوں کا جبر و تشدد نہ ہوتا، جو کہ جلد ختم ہونے والا ہے، تو اسلام کی آئیڈیالوجی اور نظام کا دوبارہ نفاذ آنکھ جھپکنے سے زیادہ تیزی سے وقوع پزیر ہو جاتا... ہم

اپنی بات کا اعادہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ان اقوام و قبائل کو اسلامی قالب میں ڈھالنے کے سلسلے میں اسلامی فکری قیادت کو جو کامیابی حاصل ہوئی، وہ بے نظیر کامیابی تھی۔ یہ اقوام و قبائل آج تک مسلمان ہیں، باوجودیکہ عقائد کو بگاڑنے اور افکار کو زہر آلود کرنے کے لیے استعمار کی کاروائیاں، خباثتیں اور چالیں زور وشور سے جاری ہیں۔ یہ عوام اور اقوام تا قیامت امتِ مسلمہ و امتِ واحدہ ہی رہیں گے۔ جب سے ان اقوام و قبائل نے اسلام قبول کیا ہے، ان میں سے کوئی ایک گروہ بھی دائرۂ اسلام سے نکل کر مرتد نہیں ہوا۔

اندلس کے مسلمانوں کی 'محاکمِ تفتیش' کے ہاتھوں تباہی و بربادی، جلادوں کا انہیں جلا کر مارنے اور پھانسیاں دینے، اسی طرح بخارا، وسط ایشیاء اور ترکستان کے مسلمانوں پر لرزا دینے والے مظالم اور مصائب کے باوجود ان اقوام کا اسلام کو تھامے رکھنے اور امتِ واحدہ میں ڈھل جانے اور اپنے عقیدے کی سخت حفاظت کرنے، سے اسلام کی فکری قیادت کی کامیابی اور نفاذِ اسلام میں اسلامی ریاست کی کامیابی اور کامرانی کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

اسلامی فکری قیادت کی کامیابی کی دوسری دلیل یہ ہے کہ امتِ مسلمہ دنیا بھر میں تہذیب، تمدن، ثقافت اور سائنس میں سب اقوام سے اعلیٰ و برتر تھی۔ اسلامی ریاست پوری دنیا میں بارہ سو سال تک یعنی چھٹی صدی عیسوی سے اٹھارویں صدی کے نصف تک سب سے عظیم اور قوی ترین ریاست تھی۔ یہی ریاست پوری دنیا میں آب وتاب کا مظہر تھی اور تمام دنیا میں اسی ریاست کا سورج چمکتا رہا۔ یہ امر اس قیادت کی کامیابی کی دلیل ہے اور اسلام کے نظام اور عقائد کے نفاذ کی کامیابی کی دلیل ہے۔ لیکن جب اسلامی ریاست اور امتِ مسلمہ اسلام کی فکری قیادت کو دنیا تک لے جانے اور اسلام کی طرف دعوت دینے سے دستبردار ہو گئی اور اس نے اسلام کو سمجھنے اور نافذ کرنے میں کوتاہی برتی، تو یہ دنیا کی دیگر اقوام سے پیچھے رہ گئی۔

لہٰذا ہم یہ کہتے ہیں کہ اسلامی فکری قیادت ہی صالح قیادت ہے اور صرف اسی کو پوری دنیا تک پہنچایا جائے۔ جب اس فکری قیادت کی حامل ریاست وجود میں آئے گی تو آج بھی اس فکری قیادت کو ویسی ہی کامیابی حاصل ہو گی جیسا کہ اسے ماضی میں حاصل ہو چکی ہے۔

ہم یہ ثابت کر چکے ہیں کہ اسلام اپنے عقیدے اور اس سے پھوٹنے والے نظام کے اعتبار سے انسانی فطرت کے موافق ہے۔ اس لیے کہ اسلام انسان کو مشینی وجود نہیں سمجھتا جو کسی کاغذی نقشے پر پایا جاتا ہے اور جس پر کسی نظام کو ریاضی کے دقیق حساب و شمار کی مانند، بغیر کسی کمی بیشی کے، نافذ کر دیا جائے۔ بلکہ انسان، جس پر نظام کو نافذ کیا جا رہا ہے، کو ایک ایسا اجتماعی وجود سمجھنا چاہیے جس میں مختلف انسانوں کی قوتوں اور خاصیتوں میں فرق و تفاوت پایا جاتا ہے۔ اس لیے ایک پہلو سے یہ بات بالکل طبعی ہے کہ اگر انسانوں کی کئی قدریں ایک سی ہیں تو دوسری طرف وہ سب مکمل طور پر ایک جیسے بھی نہیں۔ جبکہ ان سب کو سکون و اطمینان کی ضمانت ملنا ضروری ہے۔ اس طرح ایک اور پہلو سے یہ بھی طبعی ہے، جو کہ اس وقت موضوعِ بحث ہے کہ اس نظام کی تنفیذ کے دوران اس کے بہت سے پہلوؤں سے مختلف افراد انحراف کریں گے اور اس کی مخالفت بھی کریں گے۔ اسی طرح کچھ افراد اس نظام کو قبول نہیں کریں گے اور کچھ افراد اس نظام سے منہ موڑیں گے۔ چنانچہ یہ لازمی امر ہے کہ معاشرے کے اندر فُساق، فُجار، کفار، مرتد، منافق اور ملحد موجود ہوں گے۔ لیکن معاشرہ کا اصل اعتبار اس کی مجموعی حیثیت سے ہوا کرتا ہے کیونکہ معاشرہ افکار، جذبات، نظام ہائے حیات اور انسانوں کے مجموعے کا نام ہے۔ کسی معاشرے کو صرف اس وقت اسلامی معاشرہ کہا جا سکتا ہے جب اس میں اسلام نافذ ہو اور اسلام کا اظہار معاشرے کے ان تمام اجزاء سے ہو رہا ہو۔

اس کی دلیل یہ ہے کہ کسی انسان کے لیے بھی اس طرح اسلامی نظام کو نافذ کرنا ممکن نہیں ہے کہ جس طرح محمد نے نافذ کیا تھا۔ لیکن اس کے باوجود ہم دیکھتے ہیں کہ آپ کے دور میں کفار بھی موجود تھے اور ملحد بھی، منافق اور فسّاق بھی پائے جاتے تھے اور فجار و مرتدین بھی۔ لیکن اس کے باوجود کوئی شخص یہ بالکل نہیں کہہ سکتا کہ آپ کے

دور میں کامل و مکمل طور پر اسلامی نظام کا نفاذ نہیں ہوا اور یا یہ کہ وہ معاشرہ غیر اسلامی تھا۔ بات یہی ہے کہ اسلام کو جن انسانوں پر نافذ کیا جاتا ہے، وہ ایک اجتماعی وجود ہوا کرتا ہے نہ کہ ایک مشینی وجود۔

پس تمام امتِ مسلمہ پر، خواہ وہ عرب تھی یا عجم، صرف اور صرف اسلام ہی کو نافذ کیا جاتا رہا۔ اسلام کا نفاذ رسول اللہ ﷺ کی مدینہ ہجرت سے لے کر اسلامی علاقوں پر استعمار کے غلبہ تک برقرار رہا، پھر استعمار نے اسلام کے نظام کو سرمایہ دارانہ نظام سے تبدیل کر دیا۔

گویا ہجرت کے پہلے سال سے لیکر 1336 ہجری بمطابق 1918 عیسوی تک عملی طور پر صرف اسلام ہی نافذ رہا۔ اس تمام عرصہ کے دوران امتِ مسلمہ نے اسلام کے نظام کے علاوہ کسی اور چیز کو نافذ نہیں کیا۔

باوجودیکہ مسلمانوں نے اجنبی فلسفے، سائنس اور مختلف اجنبی ثقافتوں کے ترجمے عربی زبان میں کیے۔ لیکن انہوں نے کسی قانون یا کسی بھی امت یا قوم کے کسی بھی قانونی نظام کا ترجمہ عربی زبان میں بالکل نہیں کیا، نہ عملی نفاذ کے لیے اور نہ ہی درس وتدریس کے لیے۔ البتہ یہ درست ہے کہ بحیثیت ایک اجتماعی نظام کے، کچھ لوگوں نے اسلام کا نفاذ احسن طریقے سے کیا اور کچھ نے اس کے نفاذ میں کمی و بیشی کا مظاہرہ کیا۔ اس کا انحصار اسلامی ریاست کی قوت وضعف، اسلام کو صحیح طور پر سمجھنے یا نہ سمجھنے نیز اسلامی فکری قیادت کو آگے پہنچانے کے لیے امت کے اندر موجود قوت وطاقت یا اس میں غفلت وسُستی پر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بعض ادوار میں جب اسلامی نظام کی تنفیذ میں سستی اور غلطی کا ارتکاب کیا گیا تو اسلامی معاشرہ کسی حد تک تنزل کا شکار ہو گیا۔ لیکن اس کمزوری سے تو کوئی نظام بھی محفوظ نہیں رہ سکتا۔ کیونکہ نظام خواہ کوئی بھی ہو، اس کے نفاذ کے لیے انحصار تو انسانوں ہی پر کرنا پڑتا ہے۔ چنانچہ یہ یاد رکھنا چاہیے کہ اسلام کے نفاذ میں اگر کوتاہی ہوئی تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ اسلام کو نافذ نہیں کیا گیا بلکہ اس سے تو یہ ثابت ہوتا ہے کہ اسلام ہی کو نافذ کیا گیا تھا۔ کیونکہ تنفیذ میں اصل اعتبار اُن قوانین اور نظام ہائے حیات کا ہوتا ہے، ریاست جن پر عمل کرنے کا حکم دیتی ہے۔ اس لحاظ سے ریاست نے اسلام کی بجائے کوئی بھی اجنبی قانون یا نظام ہائے حیات اختیار نہیں

کیا۔ ان تمام ادوار میں بعض اوقات صرف اتنا ہوا کہ بعض حاکموں نے اسلامی نظام کے بعض احکامات کو غلط انداز میں نافذ کیا۔ علاوہ ازیں ہمارے لیے ضروری ہے کہ جب ہم اسلامی تاریخ مطالعے کے دوران اسلام کے نفاذ کا جائزہ لیں تو دو چیزوں کا ضرور خیال رکھیں: ایک یہ کہ ہم تاریخ کو دشمنانِ اسلام اور اسلام سے بغض رکھنے والوں سے اخذ نہ کریں۔ بلکہ جب ہم مسلمانوں سے بھی تاریخ کو اخذ کریں تو اسے بڑی احتیاط اور باریک بینی سے حاصل کریں۔ تاکہ کہیں ہم اس کی بگڑی ہوئی صورت نہ لے لیں۔ دوسری چیز یہ کہ ہمیں افراد یا معاشرے کے کسی ایک پہلو کی تاریخ پر تمام معاشرے کو عمومی طور پر قیاس کرنے سے اجتناب کرنا چاہیے۔ مثلاً ہم یزید کے عہد سے تمام اموی عہد کی تاریخ کو اخذ کریں یا اسی طرح عہدِ عباسی کے خلفاء کی تاریخ کو ہم اس عہد کے خلفاء کے بعض واقعات سے اخذ کریں یا عہدِ عباسی میں موجود معاشرے پر 'کتاب الاغانی' کو پڑھ کر حکم لگائیں، جو بذلہ سنج و لطیفہ گو شعراء اور ادیبوں کی خبریں جمع کرنے کے لیے تالیف کی گئی تھی یا کسی عہد کی تاریخ کو اس عہد میں لکھی جانے والی تصوف کی کتابوں اور ان جیسی دیگر کتب کو پڑھ کر حاصل کریں اور یوں کسی دور پر یہ حکم لگادیں کہ یہ فسق و فجور کا دور تھا یا زہد و تقویٰ کا دور تھا۔ بلکہ ہم پر لازم ہے کہ ہم معاشرے کو بحیثیتِ مجموعی لیں اور اس کی تدریس ایک عام طریقے سے نہ ہو بلکہ ایک جامع طریقے سے ہو۔ ہمیں اس بات سے بھی آگاہ رہنا چاہئے کہ کسی بھی دور میں اسلامی معاشرے کی بحیثیت معاشرہ کوئی باضابطہ تاریخ نہیں لکھی گئی۔ اس سلسلے میں جو کچھ لکھا گیا ہے وہ صرف بعض حاکموں اور حکمرانوں کے متعلق خبریں ہیں۔ اور جن لوگوں نے یہ خبریں تحریر کی ہیں، وہ خود بھی قابلِ اعتماد اور ثقہ نہیں، اور یہ لوگ یا تو الزام تراشی کرنے والے تھے یا پھر مدح سرائی کرنے والے تھے۔ لہٰذا انہوں نے جو کچھ لکھا اسے بلا تحقیق قبول نہیں کیا جاسکتا۔

جب ہم اس بنیاد پر اسلامی معاشرے کا مطالعہ کریں، یعنی ہر پہلو سے اور گہری تحقیق کے ذریعے، تو ہم اس معاشرے کو تمام معاشروں سے بہتر پاتے ہیں۔ یہ معاشرہ پہلی، دوسری اور تیسری صدی ہجری تک اپنی اس حالت پر قائم رہا اور اسکے بعد بارہویں صدی ہجری کے نصف تک بھی اس کی یہی حالت تھی۔ اور تمام ادوار میں اسلام کو نافذ کیا

گیا حتیٰ کہ دولتِ عثمانیہ کے آخری عہد تک بحیثیتِ اسلامی ریاست ایسا ہی تھا۔ علاوہ ازیں جب ہم تاریخ کا مطالعہ کریں تو اسے کسی نظام اور فقہ کے لیے بنیاد یا مصدر بنانا درست نہیں۔ بلکہ نظام کو قانونی مصادر سے حاصل کیا جانا چاہیے، نہ کہ تاریخ سے۔ کیونکہ تاریخ اس نظام کا مصدر نہیں ہوتی۔ مثلاً اگر ہم کمیونزم کو سمجھنا چاہیں تو ہم اسے روس کی تاریخ سے حاصل نہیں کریں گے بلکہ ہم اسے کمیونسٹ آئیڈیالوجی کی کتب سے حاصل کریں گے۔ اسی طرح اگر ہم انگلستان کے علمِ قانون کو سمجھنا چاہیں تو ہم اسے انگلستان کی تاریخ سے حاصل نہیں کر سکتے بلکہ ہم انگلستان کے علمِ قانون کا مطالعہ کریں گے۔ اس اصول کا اطلاق ہر نظام اور ہر قانون پر ہوتا ہے۔

اسلام ایک ایسی آئیڈیالوجی ہے جس کا اپنا عقیدہ اور اپنا نظام ہے۔ پس ہمیں اس کی معرفت حاصل کرنے اور اس میں موجود احکامات کو اخذ کرنے کے لیے تاریخ کو مصدر بالکل نہیں بنانا چاہیے۔

اسلام کے نظام کی معرفت حاصل کرنے کی بنیاد اسلامی فقہ کی کتابیں ہیں اور اس کے احکامات کو اخذ کرنے کے لیے مصدر اَدِلَّه تَفْصِيلِيّه ہیں۔ اس لیے اسلامی نظام کے لیے تاریخ کو مصدر بنانا بالکل صحیح نہیں، نہ معرفت حاصل کرنے کے لیے اور نہ استدلال کے لیے۔ لہٰذا یہ درست نہیں کہ اسلامی احکامات کے لیے ہم عمر بن خطاب ص یا عمر ابن عبدالعزیز یا ہارون الرشید کی تاریخ کو ماخذ قرار دے دیں، نہ ان کے دور میں رونما ہونے والے واقعات کو اور نہ ہی ان کے دور میں تالیف شدہ کتب کو۔ لہٰذا کسی واقعہ کے حوالے سے عمر کی رائے کی اتباع اس حیثیت میں کرنی چاہیے کہ گویا یہ وہ حکمِ شرعی ہے جس کا عمر نے استنباط کیا اور اسے نافذ کیا، بالکل اسی طرح جیسے ہم کسی ایسے حکمِ شرعی کا اتباع کریں جسے امام ابو حنیفہ یا امام شافعی یا امام جعفر یا ان جیسے دیگر آئمہ کرام نے مُسْتَنْبِطْ کیا ہو۔ اور اس کی اتباع ایک تاریخی واقعہ کی حیثیت سے نہیں کرنی چاہئے۔ چنانچہ یہ سمجھنا چاہیے کہ اسلامی نظام کو اختیار کرنے یا اس کی معرفت حاصل کرنے کے لیے تاریخ کی کوئی حیثیت نہیں۔ اسی طرح اگر یہ معلوم کرنا ہو کہ کوئی نظام نافذ کیا گیا یا نہیں، تو اسے معلوم کرنے کے لیے بھی تاریخ کو نہیں بلکہ فقہ ہی کو بنیاد بنانا چاہیے۔ کیونکہ ہر عہد کی اپنی کچھ نہ کچھ مشکلات ہوتی ہیں اور ان

مشکلات کا کسی نہ کسی نظام کے ذریعے تدارک کیا جاتا ہے۔ چنانچہ اگر ہمیں یہ جاننے کی ضرورت ہو کہ وہ کون سا نظام تھا کہ جس کے ذریعے اس عہد کی مشکلات کا تدارک کیا جاتا رہا، تو اس کے لیے ہمیں اس عہد کے تاریخی حوادث کی طرف رجوع نہیں کرنا چاہیے، کیونکہ ان میں تو صرف خبروں کو نقل کیا جاتا ہے۔ بلکہ اس کے لیے اُس نظام یعنی اسلامی فقہ کی طرف رجوع کرنا چاہیے، جو اُس دور میں نافذ رہی ہو۔ جب ہم اس نظر سے کسی عہد کو دیکھتے ہیں تو ہمیں نظر آتا ہے کہ مسلمانوں نے کسی بھی دور میں نہ تو کسی غیر اسلامی نظام کو اختیار کیا اور نہ ہی انہوں نے اپنے طور پر کسی نظام کو گھڑ کر نافذ کیا۔ بلکہ مسلمانوں نے جس چیز کو بھی اختیار کیا، وہ شرعی دلائل سے مستنبط تھی۔ ہر دور کے مسلمانوں کی یہ خواہش تھی کہ ان کی فقہ اقوالِ ضعیفہ یعنی کمزور استنباط سے پاک رہے۔ حتیٰ کہ اگر کسی مجتہد مطلق کا قول بھی ضعیف ہو تا تو لوگ اس پر عمل کرنے سے دوسروں کو منع کرتے تھے۔

اس لیے تمام عالمِ اسلام میں اسلامی فقہ کے علاوہ کسی قسم کی قانونی نصوص کا وجود نہیں ہے۔ تمام عالمِ اسلام میں جو کچھ بھی ہے وہ صرف فقہئ اسلامی ہے۔ امت کے اندر صرف ایک طرح کی قانونی نصوص کا پایا جانا اور اس کے علاوہ کسی اور قانون نصوص کا فقدان اس امر پر دلالت کرتا ہے کہ امتِ مسلمہ قانون سازی میں فقہی نصوص کے علاوہ کسی اور چیز کو استعمال نہیں کرتی تھی۔

تاریخ کی طرف توجہ دینے کی اگر اجازت ہو تو وہ کسی نظام کی تنفیذ کی کیفیت کا اندازہ لگانے تک محدود ہو گی۔ کیونکہ ممکن ہے کہ تاریخ میں ایسے سیاسی حوادث کا ذکر ہو، جن سے نظام کے نفاذ کی کیفیت کا اندازہ ہو سکے۔ لیکن اس میں بھی ضروری ہے کہ ہم اسے انتہائی احتیاط اور تحقیق کے بعد اور مسلمان مؤرخین سے حاصل کریں۔ تاریخ کے تین مصادر ہیں: تاریخ کی کتابیں، آثار اور روایات۔ کتبِ تاریخ کو مصدر کے طور پر اختیار کرنا جائز نہیں، کیونکہ یہ اس دور کے سیاسی حالات سے متاثر ہوتی ہیں اور ان میں جھوٹ کی آمیزش بھی ہوتی ہے، یہ یا تو اس عہد کی طرفداری کرتی ہیں جس کے دوران انہیں لکھا گیا ہو یا اپنے سے پچھلے ادوار کے لوگوں پر تنقید کرتی ہیں۔ اس کی بہترین مثال مصر کے علوی

خاندان کی تاریخ ہے جو 1952ء سے قبل تاریخ کی کتابوں میں بڑی شاندار تھی لیکن 1952 کے بعد یہ تاریخ انتہائی بھیانک دکھائی دیتی ہے۔ اسی طرح آج کے دور کے یا ماضی کے سیاسی حوادث کی تاریخ کا بھی یہی حال ہے۔ چنانچہ تاریخ کی کتابوں کو مصدر بنانا بالکل جائز نہیں، خواہ یہ اُس دور کے لوگوں کی سوانح حیات ہی کیوں نہ ہوں۔

جہاں تک آثار کا تعلق ہے تو اگر غیر جانبداری سے ان کا مطالعہ کیا جائے تو یہ کسی چیز کی حقیقی تاریخ کا پتہ دے سکتے ہیں، اگرچہ یہ تاریخ مسلسل نہیں ہوتی۔ علاوہ ازیں یہ آثار بعض حوادث کے ثبوت پر دلالت بھی کر سکتے ہیں۔ مسلمان ممالک میں پائے جانے والے آثار، خواہ یہ عمارتوں کی شکل میں ہوں یا آلات کی شکل میں یا کوئی اور چیز ہوں جنہیں تاریخی طور پر معتبر سمجھا جاتا ہو، کا مطالعہ کرنے سے اس امر کا یقینی اور قطعی ثبوت ملتا ہے کہ عالمِ اسلام میں اسلامی احکام اور نظام کے علاوہ کسی دوسرے نظام یا احکامات کا کوئی وجود نہیں تھا۔ مسلمانوں کی زندگی اور ان کے تصرفات صرف اور صرف اسلامی تھے۔

جہاں تک روایت کا تعلق ہے، تو اس پر بھی اعتماد کیا جا سکتا ہے، بشرطیکہ روایت صحیح ہو، اور اس میں اسی طریقے کو اختیار کیا گیا ہو، جس پر احادیث کی روایت میں عمل کیا گیا ہے۔ تاریخ کو بھی اسی اسلوب پر لکھنا چاہیے۔ یہی وجہ ہے کہ جب مسلمانوں نے تالیف کا آغاز کیا تو وہ اس طریقۂ روایت پر چلے۔ چنانچہ قدیم کتبِ تاریخ، مثلاً تاریخِ طبری، سیرت ابن ہشام اور ان جیسی دوسری کتبِ تاریخ کو اسی اسلوب پر تالیف کیا گیا۔ لہٰذا مسلمانوں پر لازم ہے کہ وہ اپنے آپ کو اور اپنے بچوں کو ایسی کتب سے تعلیم دیں، جو مندرجہ بالا طریقے سے تحریر کی گئی ہوں۔ اور ان کتب سے بچیں جن کا اسلوب اس سے مختلف ہو۔ اسی طرح اسلامی نظام کی تطبیق کا جائزہ لینے کے لیے بھی ایسی کتب پر انحصار نہ کریں۔

مندرجہ بالا بحث سے معلوم ہوا کہ گزشتہ تمام ادوار میں اسلام ہی نافذ تھا۔ حتیٰ کہ پہلی جنگِ عظیم کے اختتام پر جب خلافت کا خاتمہ کر دیا گیا تو 'لارڈ ایلن بی' نے، جو بیت المقدس کی فتح کے دوران سپہ سالار تھا، اس جنگ کے اختتام

کا اعلان ان الفاظ میں کیا: ''آج صلیبی جنگوں کا اختتام ہو گیا ہے۔'' اس وقت سے اب تک زندگی کے تمام مسائل اور معاملات میں کافر استعمار ہم پر اپنے سرمایہ دارانہ نظام کو نافذ کرتا چلا آ رہا ہے اور اس غلبہ کو دائمی بناتا چلا جا رہا ہے۔ لہٰذا اس فاسد اور بوسیدہ نظام کو، جسے استعمار نے ہمارے ملکوں پر نافذ کیا ہے، جڑ سے اکھاڑ پھینکنے کے علاوہ اور کوئی چارہ نہیں، تاکہ اسلامی زندگی کا از سرِ نو آغاز ہو سکے۔

یہ بہت سطحی فکر ہے کہ ہم اسلامی نظام کی جگہ کوئی دوسرا نظام اختیار کر لیں یا یہ کہ عقیدہ کے بغیر نظام کو نافذ کرنے سے مسائل حل ہو جائیں گے۔ بلکہ ہمارے لیے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ پہلے عقیدہ کو اختیار کیا جائے، پھر اس سے پھوٹنے والے نظام کو نافذ کیا جائے۔ اسی صورت میں امت کی نجات ممکن ہے۔

یہ سب کچھ اس امت کے بارے میں ہے، جس کی کوئی آئیڈیالوجی ہو اور جس کی ریاست اس آئیڈیالوجی کی بنیاد پر قائم کی جائے۔ جہاں تک دوسرے گروہوں یا اقوام کا تعلق ہے، تو ان پر اسلام کو نافذ کرنے کے لیے اس امر کی کوئی قید نہیں کہ وہ پہلے اس آئیڈیالوجی کو اختیار کریں، پھر ان پر اس آئیڈیالوجی کا نفاذ ہو۔ بلکہ اس مبدا ئکی حامل اور علمبردار اُمت کسی بھی قوم یا گروہ پر اس نظام کو نافذ کر سکتی ہے، خواہ اس نے ابھی تک اس مبدأ کو اختیار نہ کیا ہو۔ کیونکہ یہ نفاذ اس کے لیے نشاۃِ ثانیہ کا سبب بن جائے گا، اور آخر کار یہی اَمر اُسے اس عقیدہ کو اختیار کرنے پر مجبور کر دے گا۔ لہٰذا جس پر اس نظام کو نافذ کیا جا رہا ہو، اس کے لیے آئیڈیالوجی کو پہلے اختیار کرنا ضروری نہیں۔ البتہ جو اس نظام کو نافذ کر رہا ہو، اسے پہلے اس مبدا ئکو اختیار کرنا پڑے گا۔ اسی طرح قومیت کو اشتراکی نظام کے ساتھ اختیار کرنا اس لیے خطرناک ہے کہ اشتراکی نظام کو اس کی مادی فکر سے جدا کر کے اختیار کرنا ممکن نہیں۔ کیونکہ ایسا کرنے کی صورت میں نہ تو وہ مؤثر ہو گا اور نہ ہی نتیجہ خیز۔ اور اسے اس کی مادی فکر کے ساتھ اختیار کرنا بھی ممکن نہیں، کیونکہ یہ ایک ایسی منفی فکر ہے، جو فطرتِ انسانی کے مخالف ہے۔ یہ اس بات کا تقاضا کرتی ہے کہ پہلے اسلامی عقیدہ کو ترک کیا جائے، پھر اسے اختیار کیا جائے۔ اس لیے اس بات کی کوئی گنجائش اور جواز موجود نہیں کہ ہم اشتراکیت کو اختیار کریں اور ساتھ ساتھ

اسلام کے روحانی پہلو کو بھی محفوظ رکھیں۔ اس صورت میں ہم نہ تو اسلام کو اختیار کر سکیں گے اور نہ ہی اشتراکیت کو۔ کیونکہ یہ دونوں ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ ہمارے لیے یہ بھی جائز نہیں کہ ہم اسلام کے نظام کو تو لے لیں اور اُس عقیدہ کو پس پشت ڈال دیں، جس سے یہ نظام نکلتا ہے۔ کیونکہ اس صورت میں یہ نظام منجمد اور روح سے خالی ہو جائے گا۔ بلکہ ہمارے لیے ضروری ہے کہ ہم مکمل اسلام کو اس کے عقیدہ اور مکمل نظام کے ساتھ لیں اور جب ہم دوسروں کو اس کی دعوت دیں، تو ہم خود اس کی فکری قیادت کے حامل اور علمبردار ہوں۔

پس ہمارے لیے نشاۃِ ثانیہ کا ایک ہی راستہ ہے اور وہ یہ کہ ہم اسلامی زندگی کا از سرِ نو آغاز کریں اور اسلامی زندگی کا آغاز اسلامی ریاست کے قیام کے بغیر ممکن نہیں۔ یہ صرف اس صورت میں ممکن ہے کہ ہم پورے کے پورے اسلام کو اختیار کریں عقیدہ کے طور پر بھی، جو انسان کے سب سے بڑے عُقدہ کو حل کرتا ہے اور اس پر زندگی کے بارے میں نقطۂ نظر کو مرتکز کرتا ہے، اور نظام کے طور پر بھی، جو اس عقیدہ سے پھوٹتے ہیں۔ ان نظاموں کی اساس کتاب اللہ اور سنتِ رسول اہے۔ اور اس کا ثقافتی سرمایہ اسلامی ثقافت ہے جس میں فقہ، حدیث، تفسیر اور لغت وغیرہ شامل ہیں۔ چنانچہ اس کے سوا کوئی دوسرا راستہ نہیں کہ ہم اسلام کی طرف دعوت اور ہر جگہ اسلام کے دوبارہ کاملاً نفاذ کے ذریعے اسلامی فکری قیادت کے مکمل طور پر علمبردار بن جائیں۔ یہاں تک کہ جب امت مجموعی طور پر اور اسلامی ریاست بھی اس کی علمبردار بن جائے گی، تب ہم پوری دنیا کے سامنے اسلام کی فکری قیادت کو پیش کر سکیں گے۔

نشاۃِ ثانیہ کا صرف یہی ایک طریقہ ہے: یعنی اسلامی فکری قیادت کو پہلے مسلمانوں کے سامنے پیش کیا جائے تاکہ مسلمان اسلامی زندگی کا از سرِ نو آغاز کریں اور پھر اسلامی ریاست کے ذریعہ اس فکری قیادت کو تمام انسانیت کے سامنے پیش کریں۔

اسلامی دعوت کو پیش کرنے کی کیفیت

مسلمان دنیا کی امامت (قیادت) سے اپنے دین پر کاربند رہنے کی وجہ سے پیچھے نہیں رہے بلکہ ان کے زوال کا آغاز اس وقت ہوا جب انہوں نے اپنے دین سے وابستگی کو ترک کر دیا، اس دین میں سُستی کا مظاہرہ کیا، اجنبی تہذیب کو اپنی سرزمین میں داخل ہونے کی اجازت دی اور مغربی نظریات کو اپنے اذہان میں جگہ بنانے کا موقع فراہم کیا۔ مسلمان اسی دن اسلام کی فکری قیادت سے دستبردار ہو گئے جب وہ اسلام کی طرف دعوت دینے سے غفلت برتنے لگے اور انہوں نے اسلام کے احکامات کے نفاذ میں کجی کا مظاہرہ کیا۔ لہٰذا ترقی کی راہ پر گامزن ہونے کے لیے اسلامی زندگی کے از سرِ نو آغاز کے سوا کوئی چارہ نہیں۔ اور مسلمان اس وقت تک اسلامی زندگی کا از سرِ نو آغاز نہیں کر سکتے جب تک کہ وہ اسلامی فکری قیادت کے ذریعے اسلامی دعوت کے علمبردار نہ بن جائیں اور اسی دعوت کے ذریعے اُس اسلامی ریاست کو معرضِ وجود میں نہ لے آئیں، جو اسلام کو (دنیا کے سامنے) پیش کرنے کے لیے اس کی فکری قیادت کی علمبردار ہو۔

یہاں اس امر کی وضاحت ضروری ہے کہ مسلمانوں کی نشاۃِ ثانیہ کے لیے اسلامی فکری قیادت کا علمبردار بننا صرف اسلام کی دعوت کو پیش کرنے کے ذریعے ہی ممکن ہے کیونکہ یہ صرف اسلام ہی ہے جو دنیا کی اصلاح کر سکتا ہے۔ کیونکہ حقیقی نشاۃِ ثانیہ اسلام کے بغیر ممکن ہی نہیں، خواہ یہ نشاۃِ ثانیہ اختیار کرنے والے مسلمان ہوں یا غیر مسلم۔ چنانچہ اسی بنیاد پر لازمی ہے کہ اسلامی دعوت کا علمبردار بنا جائے۔

یہ بھی ضروری ہے کہ اس دعوت کو دنیا کے سامنے ایسی فکری قیادت کے طور پر پیش کرنے کی بھرپور کوشش کی جائے جس سے زندگی کے نظام پھوٹتے ہوں۔ تمام افکار کی بنیاد اسی فکری قیادت پر ہو اور انہی افکار سے وہ تمام تصورات جنم لیتے ہوں جو بلا استثناء زندگی کے بارے میں ہر نقطۂ نظر پر اثر انداز ہوتے ہیں۔

آج اسلامی دعوت کو اسی طرح پیش کیا جانا چاہیے جیسا کہ اسے پہلے پیش کیا گیا تھا۔ اور دعوت میں رسول اللہ ﷺ کی مکمل اتباع کی جانی چاہئے۔ اس دعوت کو پیش کرنے کے طریقے کی کُلیات اور جزئیات میں بال برابر کمی بیشی نہیں ہونی چاہئے اور نہ ہی زمانے کے اختلاف کا کچھ لحاظ کرنا چاہئے۔ کیونکہ جو چیز تبدیل ہوئی ہے وہ اشکال اور وسائل ہیں نہ کہ معنی وجوہر۔ معنی وجوہر میں اب تک کوئی تبدیلی ہوئی ہے اور نہ آئندہ کبھی ہوگی، خواہ زمانے پے در پے گزرتے چلے جائیں اور اقوام و ممالک مختلف ہوتے چلے جائیں۔

اسی لیے اسلامی دعوت کو پیش کرنے کے لیے صراحت، جرأت، قوت اور فکر کی ضرورت ہے؛ کہ نتائج اور حالات کو نظر انداز کر کے اسلامی فکر اور طریقہ سے متصادم ہر چیز کو چیلنج کیا جائے اور اس میں پائے جانے والے جھوٹ اور کھوٹ کو کھول کر بیان کیا جائے، اس بات سے قطع نظر کہ حالات کیسے ہیں اور اس کے نتائج کیا ہوں گے۔

اسلامی دعوت کو پیش کرنا اس امر کا تقاضا بھی کرتا ہے کہ مکمل بالادستی اسلام کی آئیڈیالوجی کو حاصل ہو، اس سے قطع نظر کہ یہ جمہور کے موافق ہے یا مخالف، لوگوں کی عادات کے ساتھ چلتا ہے یا ان سے متضاد ہے، لوگ اسے قبول کرتے ہیں یا رد کرتے ہیں اور اس کی مخالفت کرتے ہیں۔ پس ایک داعی نہ تو قوم کی چاپلوسی کرتا ہے اور نہ ہی خوشامد سے کام لیتا ہے۔ وہ اربابِ اقتدار کی بھی رعایت نہیں کرتا۔ اسی طرح وہ لوگوں کی عادات اور روایات کی کوئی پروا کرتا ہے اور نہ ہی لوگوں کی قبولیت یا ان کے انکار کو کسی گنتی میں لاتا ہے۔ وہ صرف آئیڈیالوجی کو مضبوطی سے تھامتا ہے۔ آئیڈیالوجی کے علاوہ کسی دوسری چیز کو کسی شمار و قطار کے قابل سمجھے بغیر صرف آئیڈیالوجی ہی کو صراحت سے بیان کرتا ہے۔ چنانچہ دوسری آئیڈیالوجیز کے حامل افراد کو یہ نہیں کہا جائے گا کہ تم اپنی ہی آئیڈیالوجی پر قائم رہو بلکہ کسی قسم کی زبردستی کے بغیر انہیں اسلام کی آئیڈیالوجی کی طرف دعوت دی جائے گی تاکہ وہ اسے قبول کر لیں۔ کیونکہ دعوت اس امر کا تقاضا کرتی ہے کہ اس آئیڈیالوجی کے علاوہ کوئی دوسری آئیڈیالوجی باقی نہ رہے اور بالادستی صرف اسلامی کی آئیڈیالوجی کو حاصل ہو جائے۔ ارشاد ہے:

(هُوَ الَّذِیْ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰی وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَی الدِّیْنِ کُلِّهٖ وَلَوْکَرِهَ الْمُشْرِکُوْنَ)

''اللہ وہی تو ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور دینِ حق کے ساتھ مبعوث فرمایا تاکہ وہ اسے تمام ادیان پر غالب کردے اگرچہ یہ بات مشرکین کو ناپسند ہی کیوں نہ ہو'' (الصف:8)

پس جب رسول اللہ انسانیت کی طرف یہ پیغام لے کر آئے تو آپ نے جس حق کی طرف دعوت دی، آپ اس پر کامل ایمان رکھتے تھے۔ آپ نے پوری دنیا کو چیلنج کیا، اور لوگوں کی عادات، روایات، ادیان، عقائد، حکام اور رعایا کا لحاظ کیے بغیر ہر سرخ وسیاہ کے خلاف جنگ کا اعلان کر دیا۔ آپ نے اسلام کے پیغام کے سوا کسی اور چیز کو قابلِ التفات نہیں سمجھا۔ آپ نے دعوت کا آغاز قریش کے معبودوں کے ذکر اور ان کے عیب گنوانے سے کیا۔ آپ نے ان کے اعتقاد کو چیلنج کیا اور ان میں پائے جانے والے بودے پن کو بے نقاب کیا، حالانکہ اس وقت آپ اتنِ تنہا تھے۔ وہ اسلام جس کی طرف آپ ادعوت دیتے تھے، اس پر مضبوط اور غیر متزلزل ایمان کے علاوہ آپ اکے پاس کوئی ساز وسامان، مددگار یا اسلحہ نہ تھا۔ آپ نے عربوں کی عادات وروایات کی کوئی پروا کی، نہ ہی ان کے ادیان اور عقائد کی۔ اس معاملے میں ان کے ساتھ نہ کوئی نرمی برتی اور نہ ہی کسی قسم کی کوئی رُورعایت روا رکھی۔

اسی طرح اسلامی دعوت کا علمبردار بھی بے باک اور ہر چیز کو للکارنے والا ہوتا ہے۔ وہ عادات، روایات، بیمار افکار، غلط تصورات کو نشانہ بناتا ہے، حتیٰ کہ اگر رائے عامہ غلط ہو تو وہ اسے بھی چیلنج کرتا ہے، خواہ اُسے اِس رائے عامہ کیخلاف جدوجہد ہی کیوں نہ کرنی پڑے۔ اسی طرح وہ عقائد اور ادیان کو بھی چیلنج کرتا ہے، چاہے اس کے نتیجے میں اسے تعصب یا گمراہی پر جمنے والوں کے انتقام کا نشانہ ہی کیوں نہ بننا پڑے۔

اسلامی دعوت کو پیش کرنے کا تقاضا یہ بھی ہے کہ اسلام کے مکمل نفاذ کو مطمع نظر بنایا جائے اور کسی چھوٹے سے چھوٹے حکم میں بھی کوئی رعایت نہ دی جائے۔ دعوت کا علمبردار اس معاملے میں کسی قسم کی چشم پوشی، سستی، کمی

یاتاخیر کو قبول نہ کرے۔ وہ ایک امر کو مکمل طور پر اختیار کرے اور اسے جلد از جلد پورا کرے۔ وہ حق کے معاملے میں کسی کی سفارش قبول نہ کرے۔ رسول اللہ نے بنو ثقیف کے وفد کی اس درخواست کو ہر گز قبول نہ کیا کہ ان کے بُت لات کو تین سال تک توڑے بغیر چھوڑ دیا جائے اور نہ ہی اسلام لانے کے لیے اُن کی اس شرط کو قبول کیا کہ انہیں نماز معاف ہو گی۔ آپ نے اُن کے اس مطالبے کو بھی قبول نہ کیا کہ لات کو دو سال یا کم از کم ایک مہینے تک ہی چھوڑ دیا جائے۔ بلکہ آپ نے اس کا قطعی طور پر انکار فرما دیا۔ اس انکار میں کسی قسم کا تردّد یا نرمی نہ تھی، بلکہ یہ ایک اٹل فیصلہ تھا۔ کیونکہ انسان یا تو ایمان لائے یا نہ لائے، اور اس کا نتیجہ بھی جنت یا جہنم ہے۔ البتہ رسول اللہ نے یہ قبول فرمایا کہ وہ بذاتِ خود اپنے بت لات کو منہدم نہ کریں اور آپ نے ابو سفیان اور مغیرہ بن شعبہ کو اس کام کی ذمہ داری سونپی۔ جی ہاں! آپ نے صرف کامل عقیدہ اور اس کے مکمل نفاذ کو قبول فرمایا۔ عقیدہ اسی بات کا تقاضا کرتا ہے۔ تاہم جہاں تک اس کے نفاذ کے لیے مختلف ذرائع اور وسائل کا تعلق ہے، تو رسول اللہ ﷺ نے انہیں اختیار فرمایا۔ کیونکہ ان کا عقیدہ کی حقیقت سے کوئی تعلق نہیں۔ چنانچہ اسی لیے اسلام کی دعوت کے لیے مکمل فکر کی حفاظت لازمی ہے۔ اور فکرۃ یا طریقہ میں کسی قسم کی چشم پوشی کے بغیر اس کے مکمل نفاذ کی حفاظت ضروری ہے۔ البتہ بقدرِ ضرورت ذرائع کے استعمال میں کوئی نقصان نہیں۔

اسلام کی دعوت کو پیش کرنے کا تقاضا یہ بھی ہے کہ اس سے تعلق رکھنے والا ہر عمل ایک متعین نصب العین کے لیے ہونا چاہیے۔ حاملِ دعوت ہمیشہ اس نصب العین کا تصور ذہن میں رکھے اور اس کے حصول کے لیے مسلسل کوشش میں لگا رہے۔ مقصد کے حصول کی اس کوشش میں آرام کا تصور بھی ذہن میں نہ لائے۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ حاملِ دعوت عمل کے بغیر صرف فکر پر راضی نہیں ہوتا اور نہ اسے مدہوش کرنے والا خیالی فلسفہ سمجھتا ہے۔ اسی طرح وہ بے مقصد فکر و عمل پر راضی نہیں ہوتا ہے اور نہ وہ اس دعوت کو کولہو کے بیل کی گردش کی مانند تصور کرتا ہے، جو جمود

اور ناامیدی پر ختم ہوتی ہے۔ بلکہ وہ فکر و عمل کے امتزاج کے ذریعے ایک متعین مقصد کو عملی طور پر حاصل کرنے اور اسے عالمِ وجود میں لانے کی کوشش کرتا ہے۔

چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے مکہ میں اسلام کی فکری قیادت کو پیش کیا، یہاں تک کہ آپ اسمجھ گئے کہ مکے کا معاشرہ اسلام کو زندگی کے نظام کے طور پر قبول کرنے کے لیے تیار نہیں۔ چنانچہ آپ انے پھر مدینہ کے معاشرہ کو تیار فرمایا، وہاں ایک اسلامی ریاست قائم کی اور اسلام کو نافذ کیا۔ اس کے بعد اس دعوت کو دوسروں کے سامنے پیش کیا۔ پھر آپ انے اپنی امت کو تیار فرمایا تاکہ وہ آپ اکے بعد اس دعوت کی علمبردار بنے اور آپ اکے متعین کردہ راستے پر چلے۔ لہٰذا اِس وقت، جبکہ مسلمانوں کا خلیفہ موجود نہیں، یہ امر انتہائی ناگزیر ہے کہ اسلامی دعوت اسلام کی طرف اور اسلامی زندگی کا از سرِ نو آغاز کرنے کے لیے ایسی اسلامی ریاست کو وجود میں لانے کی طرف ہو، جو اسلام کو نافذ کرے اور اس کے پیغام کو پوری دنیا تک لے جائے۔ یوں یہ دعوت امت کے اندر اسلامی زندگی کے از سرِ نو آغاز سے ریاست کی جانب سے دنیا کے سامنے اسلامی دعوت کو پیش کرنے کی طرف منتقل ہو جاتی ہے، اور عالمِ اسلام میں اندرونی دعوت سے عالمی دعوت کی طرف منتقل ہو جاتی ہے۔

یہ ضروری ہے کہ اسلام کی دعوت کے دوران زندگی کے متعلق غلط تصور کی تصحیح اور اللہ کے ساتھ مضبوط تعلق استوار کرنے کو واضح طور پر بیان کیا جائے، نیز لوگوں کو ان کی مشکلات کا حل بھی بتایا جائے۔ تاکہ یہ دعوت زندگی کے تمام میدانوں میں ایک زندہ و فعال دعوت کی صورت اختیار کرے۔ چنانچہ جس طرح رسول اللہ امکہ میں لوگوں کے سامنے اس آیت کی تلاوت فرمایا کرتے تھے:

(تَبَّتْ يَدَا اَبِيْ لَهَبٍ وَّتَبَّ)

''ابو لہب کے دونوں ہاتھ تباہ ہو جائیں'' (اللھب: 1)

اسی وقت آپ ااان آیات کی تلاوت بھی فرمایا کرتے تھے:

(اِنَّه لَقَولُ رَسُولٍ کَرِیمٍ۔ وَمَا هُوَ بِقَولِ شَاعِرٍقَلِیلًا مَّا تُؤمِنُونَ)

''بے شک یہ ایک کریم پیام بر کا قول ہے،اور یہ کسی شاعر کا قول نہیں، مگر تم بہت کم ایمان لانے والے ہو''

(الحاقۃ:41,42)

اور اسی طرح آپ ااسی وقت اس آیت کی بھی تلاوت کرتے تھے:

(وَیْلٌ لِّلْمُطَفِّفِیْنَ۔ اَلَّذِیْنَ اِذَاکْتَالُوْا عَلَی النَّاسِ یَسْتَوْفُوْنَ۔ وَاِذَا کَالُوْهُمْ اَوْ وَّزَنُوْهُمْ یُخْسِرُوْنَ)

''ناپ تول میں کمی کرنے والوں کے لیے ہلاکت ہو۔جب وہ لوگوں سے لیتے ہیں تو پورا ناپ لیتے ہیں اور جب انہیں تول کر دیتے ہیں تو کم دیتے ہیں۔''(المطففین:1-3)

اور آپ یہ بھی تلاوت فرمایا کرتے تھے:

(اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوْاالصّٰلِحَاتِ لَهُمْ جَنّٰتٌ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَاالْاَنْهَارُ ذَالِکَ الْفَوْزُ الْکَبِیْر)

''بے شک جو لوگ ایمان لائے اور نیک اعمال کیے۔ان کے لیے باغات ہیں جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں، یہ بہت بڑی کامیابی ہے''(البروج:11)

اور مدینہ میں آپ لوگوں کے سامنے یہ تلاوت فرمایا کرتے تھے:

(اَقِیْمُوْا الصَّلَاۃَ وَاٰتُوا الزَّکٰوۃَ)

''نماز قائم کرو اور زکوٰۃ دیا کرو۔''(البقرۃ:43)

اسی طرح یہ بھی تلاوت فرمایا کرتے تھے:

(اِنْفِرُوْا خِفَافًا وَّثِقَالًا وَّجَاهِدُوْا بِاَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ)

''نکلو جہاد کے میدان میں خواہ (تمہاری طبیعت میں) ہلکا پن ہو یا بھاری پن اور اللہ کے راستے میں اپنے اموال اور اپنی جانوں سے جہاد کرو''(التوبۃ:41)

آپ ایہ بھی تلاوت فرمایا کرتے تھے:

(يَاَيُّهَاالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اِذَا تَدَايَنْتُمْ بِدَيْنٍ اِلٰى اَجَلٍ مُّسَمًّى فَاكْتُبُوْهُ)

''اے ایمان والو! جب تم کسی مقررہ مدت تک کے لیے کوئی قرضہ دو تو اسے ضبطِ تحریر میں لے آیا کرو۔''

(البقرۃ:282)

اور آپ اان کے سامنے یہ آیت بھی تلاوت کیا کرتے تھے:

(كَيْ لَا يَكُوْنَ دُوْلَةً بَّيْنَ الْاَغْنِيَاءِ مِنْكُمْ)

''تاکہ دولت صرف تمہارے مالداروں کے درمیان گردش نہ کرتی رہے''(الحشر:7)

اور آپ ااس آیت کی بھی تلاوت فرمایا کرتے تھے:

(لَايَسْتَوِيْ اَصْحَابُ النَّارِ وَاَصْحَابُ الْجَنَّةِ اَصْحَابُ الْجَنَّةِ هُمُ الْفَاۗىِٕزُوْنَ)

''اہل جہنم اور اہل جنت (ہر گز) برابر نہیں۔ اہل جنت ہی کامیاب ہونے والے ہیں''(الحشر:20)

اس لیے اسلامی دعوت ان تمام نظام ہائے حیات پر مشتمل ہو جو زندگی کی تمام تر مشکلات کو حل کرتے ہیں۔ کیونکہ اسلامی دعوت کی کامیابی کا راز اسکے اس طرح زندہ ہونے میں ہے کہ وہ من حیث الانسان، انسان کی تمام مشکلات کو حل کرے اور اس کے اندر ایک ہمہ گیر انقلاب برپا کر دے۔

اس دعوت کے حاملین اس وقت تک دعوت کی ذمہ داری کو نہیں اٹھا سکتے اور اس کے تقاضوں سے عہدہ برآء نہیں ہو سکتے جب تک کہ وہ اپنے اندر کمال کے حصول کا الآؤنہ جلائیں اور ہر وقت حقیقت کا کھوج نہ لگاتے رہیں۔ اور جب تک کہ وہ اپنی معلومات کی جانچ پڑتال نہ کرتے رہیں تاکہ اپنے علم کو ہر اجنبی آلائش سے پاک صاف کر دیں۔ اور ان افکار سے ہر اس چیز کو دور کر دیں جس کے متعلق احتمال ہو کہ کہیں یہ اپنی مماثلت کی وجہ سے ان افکار سے چمٹ نہ جائے۔ تاکہ حاملینِ دعوت کے افکار صاف شفاف ہوں اور بے شک افکار کا صاف شفاف ہونا ہی کامیابی اور کامیابی کے تسلسل کی ضمانت ہے۔

پھر اس دعوت کے حاملین کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ اپنی ذمہ داریوں کو یہ سمجھ کر پورا کریں کہ انہیں اللہ تعالیٰ نے ہم پر فرض کیا ہے اور اللہ تعالیٰ کی رضا کی خاطر خندہ پیشانی اور خوشی سے انہیں قبول کریں۔ اپنے اعمال کا بدلہ نہ مانگیں اور لوگوں کی جانب سے شکریے کا انتظار بھی نہ کریں اور صرف اللہ تعالیٰ ہی کی خوشنودی کے طلب گار ہوں۔

اسلامی تہذیب

تہذیب اور تمدن کے مابین فرق ہے۔ تہذیب زندگی کے بارے میں تصورات کے مجموعہ کو کہتے ہیں جبکہ تمدن اشیائے محسوسہ کی ان مادی اشکال کو کہا جاتا ہے جو زندگی کے معاملات میں زیرِ استعمال آتی ہیں۔ تہذیب زندگی کے بارے میں نقطۂ نظر کے لحاظ سے خاص ہوتی ہے جبکہ تمدن خاص بھی ہوتا ہے اور عام بھی۔ پس وہ تمدنی اشیاء جو تہذیب سے جنم لیتی ہیں، جیسے مجسمے، تو وہ خاص ہیں۔ وہ تمدنی اشیاء جو سائنس اور صنعت کی ترقی سے جنم لیتی ہیں، وہ عام ہوتی ہیں۔ یہ کسی قوم کے ساتھ مخصوص نہیں ہوتیں بلکہ یہ صنعت اور سائنس کی طرح عالمی ہوتی ہیں۔

تہذیب اور تمدن کے مابین پائے جانے والے اس فرق کو ہمیشہ مدِ نظر رکھنا چاہیے۔ جیسا کہ اس فرق کا لحاظ رکھنا ضروری ہے جو ان تمدنی اشیاء کے درمیان ہے جو تہذیب سے جنم لیتی ہیں اور جو سائنس و ٹیکنالوجی کی ترقی سے جنم لیتی ہیں۔ اس لیے تمدن کو اخذ کرتے وقت اس کی اشکال کے فرق اور تمدن و تہذیب کے درمیان فرق کا لحاظ رکھنا چاہیے۔ چنانچہ وہ مغربی تمدن، جو سائنس و ٹیکنالوجی کی پیداوار ہے، اُسے اپنانے میں کوئی امر مانع نہیں۔ وہ مغربی تمدن، جو ان کی تہذیب سے پیدا ہوتی ہے، تو اسے کسی حال میں اپنانا جائز نہیں۔ جبکہ مغربی تہذیب کو اختیار کرنا بالکل جائز نہیں، اس لیے کہ یہ اپنی بنیاد، زندگی کے بارے میں تصور نیز خوشی اور سعادت کے تصور کے لحاظ سے اسلامی تہذیب سے بالکل متصادم ہے۔

مغرب کی تہذیب دین کے دنیاوی امور سے الگ ہونے کی بنیاد پر قائم ہے اور وہ اس بات کی بھی منکر ہے کہ زندگی کے امور میں دین کا کوئی عمل دخل ہے۔ چنانچہ اس کے نتیجے کے طور پر دین کی ریاست سے علیحدگی کی فکر پیدا ہوئی۔ کیونکہ یہ اس شخص کے لیے ایک طبعی بات ہے جو دین کو زندگی سے جدا کرتا ہے اور زندگی میں دین کے وجود کا انکار کرتا ہے۔ اسی بنیاد پر زندگی اور زندگی کے نظام کی عمارت استوار ہے۔ مغربی تہذیب کی رُو سے منفعت کا حصول ہی تمام تر زندگی ہے، لہٰذا یہی اعمال کا معیار ہے۔ اسی لیے اس نظام کی بنیاد محض منفعت پر ہے اور یہی اس تہذیب کی

بنیاد ہے۔ چنانچہ اس نظام اور تہذیب میں سب سے نمایاں تصور منفعت ہے کیونکہ اس کے نزدیک زندگی کا تصور منفعت کے سوا کچھ نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے نزدیک خوشی اور سعادت یہ ہے کہ انسان کو زیادہ سے زیادہ جسمانی لذتیں اور ان کے اسباب مہیا کیے جائیں۔ اس لیے مغربی تہذیب ایک خاص منفعت پرستانہ تہذیب ہے اور اس میں منفعت کے علاوہ کسی اور چیز کا کوئی وزن نہیں۔ یہ صرف منفعت کا اعتراف کرتی ہے اور اسے اعمال کا معیار قرار دیتی ہے۔ اور جہاں تک روحانی پہلو کا تعلق ہے تو مغربی تہذیب میں روحانی پہلو انفرادی نوعیت کا ہے جس کا معاشرے کے ساتھ کوئی تعلق نہیں اور روحانی امور چرچ اور چرچ کے لوگوں تک محدود ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مغربی تہذیب میں اخلاقی، روحانی یا انسانی قدر و قیمت کا کوئی وجود نہیں۔ اور اس میں صرف مادی قدر و قیمت کا تصور پایا جاتا ہے۔ اسی وجہ سے اس میں انسانیت کے لیے کیے جانیوالے اعمال کو ان تنظیموں کے تابع رکھا گیا جو ریاست سے جُدا ہیں، جیسے ریڈ کراس اور عیسائی مشنری؛ اور مادی قدر و قیمت یعنی فائدے کے علاوہ زندگی سے ہر قیمت کو دُور کر دیا گیا ہے۔ پس مغربی تہذیب زندگی کے بارے میں انہی تصورات کا مجموعہ ہے۔

اسلامی تہذیب ایسی اساس پر قائم ہے جو مغربی تہذیب کی اساس کے متضاد ہے اور اس کے نزدیک زندگی کا نقشہ مغربی تہذیب کے زندگی کے نقشے سے بالکل مختلف ہے۔ اسلامی تہذیب میں خوشی و سعادت کا مفہوم بھی مغربی تہذیب کے مفہوم سے بالکل جدا ہے۔ اسلامی تہذیب اللہ پر ایمان رکھنے کی بنیاد پر قائم ہے اور اس بات پر ایمان کہ اللہ تعالیٰ نے کائنات، انسان اور حیات کے لیے ایک نظام بنایا ہے، اور اس بات پر ایمان کہ اللہ تعالیٰ نے سیدنا محمد ﷺ کو دینِ اسلام کے ساتھ مبعوث فرمایا۔ یعنی اسلامی تہذیب اسلامی عقیدہ کی اساس پر قائم ہے، جو اللہ تعالیٰ، ملائکہ، آسمانی کتابوں، رسولوں، آخرت کے دن پر اور قضاوقدر کے خیر و شر کے من جانب اللہ ہونے پر ایمان لانا ہے۔ چنانچہ یہ عقیدہ ہی اسلامی تہذیب کی بنیاد ہے اور یہ عقیدہ ایک روحانی بنیاد پر استوار ہے۔

اسلامی تہذیب میں زندگی کا نقشہ اسلام کے اس فلسفے سے واضح ہوتا ہے جو اسلامی عقیدے سے پھوٹتا ہے اور جس پر زندگی اور زندگی میں انسان کے اعمال قائم ہیں۔ یہ فلسفہ مادہ اور روح سے مرکب ہے، یعنی اعمال کو اللہ تعالیٰ کے اوامر و نواہی کے مطابق سرانجام دیا جائے، یہی زندگی کے نقشے کی بنیاد ہے۔ چنانچہ انسانی عمل مادہ ہے اور انسان کا عمل سرانجام دیتے وقت اس بات کا ادراک کرنا کہ اس عمل کے حلال یا حرام ہونے کی وجہ سے اللہ تعالیٰ اس کا بدلہ دے گا، روح ہے۔ اس طرح روح اور مادے کا امتزاج ہوتا ہے۔ یوں مسلمان کے اعمال کا محرک اللہ تعالیٰ کے اوامر و نواہی ہیں اور اللہ تعالیٰ کے اوامر و نواہی کے مطابق اعمال کی انجام دہی کا اصل مقصد اللہ تعالیٰ کی رضا ہے، اور یہ منفعت بالکل نہیں۔ البتہ کسی عمل کو سرانجام دینے کے ارادے کا انحصار اس عمل کی انجام دہی سے حاصل ہونے والی قیمت پر ہوتا ہے اور یہ قدر و قیمت اعمال کے اعتبار سے مختلف ہوتی ہے۔ کبھی یہ قیمت مادی ہوتی ہے جیسے نفع کے ارادے سے تجارت کرنا۔ کیونکہ انسان کا تجارت کرنا ایک مادی عمل ہے اور اس میں اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کا حصول اسے اللہ تعالیٰ کے اوامر و نواہی کے مطابق اس عمل کو سرانجام دینے پر آمادہ کرتا ہے۔ اور وہ قیمت، جسے انسان اس عمل کی انجام دہی سے حاصل کرنا چاہتا ہے وہ نفع کا حصول ہے جو کہ ایک مادی قیمت ہے۔

کبھی عمل کی قیمت روحانی ہوتی ہے جیسے نماز، زکوٰۃ، حج، روزہ وغیرہ، اور کبھی قیمت اخلاقی ہوتی ہے جیسے سچائی، امانت داری اور وفاداری۔ اور کبھی یہ قیمت انسانی ہوتی ہے جیسے ڈوبتے کو بچانا یا مصیبت زدہ کی مدد کرنا۔ انسان جب کوئی عمل سرانجام دیتا ہے تو انہی قیمتوں کے حصول کو پیشِ نظر رکھتا ہے۔ مگر یہ اعمال کا اصل محرک نہیں ہوتیں اور یہ وہ اعلیٰ معیار نہیں کہ جن کو اعمال کی انجام دہی کے وقت ہدف بنایا جائے۔ بلکہ یہ اعمال کی انجام دہی کی قیمت ہوتی ہیں جو اعمال کی نوعیت کے اعتبار سے مختلف ہوتی ہیں۔

جبکہ خوشی و سعادت تو اللہ تعالیٰ کی رضا کا حصول ہے نہ کہ انسانی حاجات کو پورا کرنا۔ کیونکہ انسان کی تمام حاجات یعنی عضویاتی حاجات یا جبلّتوں کی حاجات کو پورا کرنا انسان کی ذات کی حفاظت کا ذریعہ ہے، اور یہ سعادت کی

ضمانت نہیں۔ یہ ہے زندگی کا نقشہ اور یہ ہے وہ بنیاد جس پر یہ نقشہ قائم ہے! یہ اسلامی تہذیب کی بنیاد ہے اور یہ مغربی تہذیب کے بالکل متضاد ہے جیسا کہ اسلامی تہذیب سے نکلنے والی تمدنی اشیاء مغربی تہذیب سے نکلنے والی تمدنی اشیاء کے بالکل متضاد ہیں۔ مثلاً تصویر ایک تمدنی شکل ہے اور مغربی تہذیب ایک ایسی عُریاں نسوانی تصویر کو ایک تمدنی شکل قرار دیتی ہے، جس میں نسوانی اعضاء کے حسن وجمال کو خوب نمایاں کیا گیا ہو، اور یہ عورت کے متعلق ان کے زندگی کے تصورات سے ہم آہنگ ہے۔ اس لیے ایک مغربی انسان اسے ایک فنی شہ پارہ سمجھتا ہے اور ایک تمدنی شے کے طور پر اس پر فخر کرتا ہے، اگر اس میں فنی کمال کی تمام شرائط پوری طرح پائی جائیں۔ لیکن یہ تمدنی شے اسلامی تہذیب سے متضاد ہے اور عورت کے بارے میں اس کے تصورات کے بالکل خلاف ہے، جن کی رُو سے عورت ایک آبرو ہے اور اس کی حفاظت فرض ہے۔ اس لیے اسلامی تہذیب ایسی تصویر کشی کو ممنوع قرار دیتی ہے کیونکہ یہ جبلتِ نوع کو بھڑکانے اور اخلاقی انار کی کی طرف لے جانے کا سبب بنتی ہے۔ اسی طرح جب ایک مسلمان گھر بنانے کا ارادہ کرتا ہے، جو ایک تمدنی شکل ہے، تو وہ اس بات کا خیال رکھتا ہے کہ عورت جب گھر میں مختصر لباس پہن کر کام کاج کر رہی ہو تو اس پر باہر کے لوگوں کی نظر نہ پڑے۔ چنانچہ وہ گھر کے گرد چار دیواری بناتا ہے، اس کے بر خلاف ایک مغربی شخص ان امور کا خیال نہیں رکھتا، اور یہ مغربی تہذیب کے مطابق ہے۔ اسی کا اطلاق ان تمام تمدنی اشیاء پر ہوتا ہے جو مغربی تہذیب سے ماخوذ ہیں جیسے مجسمے وغیرہ۔ اسی طرح اگر لباس کفار کے ساتھ ان کے کفار ہونے کے اعتبار سے مخصوص ہو، تو مسلمان کے لیے ایسا لباس پہننا جائز نہیں۔ کیونکہ یہ لباس ایک خاص نقطۂ نظر کا حامل ہے۔ اگر کوئی لباس اس طرح کا ہو کہ جس سے ان کی مخصوص کافرانہ شناخت نہ جھلکتی ہو، بلکہ وہ اسے ضرورت کے طور پر یا زینت کے لیے استعمال کر رہے ہوں، تب یہ لباس عام تمدنی اشیاء میں شمار ہو گا اور اس کا استعمال جائز ہو گا۔

جہاں تک اُن تمدنی اشیاء کا تعلق ہے، جو سائنس و ٹیکنالوجی کی ترقی کی وجہ سے وجود میں آئی ہیں، جیسے لیبارٹریوں کے آلات، طبّی آلات، فرنیچر اور قالین اور اسی قسم کی دوسری چیزیں، تو یہ سب عالمی تمدنی اشیاء ہیں۔ انہیں

اختیار کرنے میں کوئی امر مانع نہیں۔ کیونکہ یہ کسی خاص تہذیب کی پیداوار نہیں ہیں اور نہ یہ کسی خاص تہذیب سے متعلق ہیں۔

یہ مغربی تہذیب، جو آج پوری دنیا پر حکومت کر رہی ہے، اس پر ایک سرسری نگاہ ڈالنے سے نظر آتا ہے کہ یہ تہذیب انسانیت کو اطمینان کی ضمانت دینے سے بالکل قاصر ہے۔ بلکہ اس کے برعکس یہ تہذیب ہی اس بدبختی اور تباہی کا سبب ہے جس سے آج پوری انسانیت دوچار ہے اور جس کی سلگائی ہوئی آگ میں تمام انسانیت جل رہی ہے۔ یہ تہذیب، جو دنیاوی امور کی دین سے جدائی کو اپنی بنیاد قرار دیتی ہے، انسانی فطرت کے بالکل خلاف ہے۔ ایسی تہذیب، جو زندگی میں روحانیت کو کوئی وزن نہیں دیتی اور جس کے نزدیک زندگی کا تصور صرف منفعت ہے، اور جو منفعت ہی کو ایک انسان کا دوسرے انسان سے تعلق گردانتی ہے، اس کا نتیجہ صرف بدبختی اور دائمی پریشانی ہی ہو سکتا ہے۔ پس جب تک منفعت اس کی بنیاد ہے، تنازعات کا اٹھنا اور انسانوں کے مابین تعلقات کے قیام کے لیے قوت پر بھروسہ کرنا اس تہذیب کی رُو سے ایک طبعی اَمر ہے۔ اسی وجہ سے اس تہذیب کے حامل افراد کے نزدیک استعمار بھی ایک طبعی امر ہے۔ چنانچہ اس تہذیب کے ہاں اخلاق بھی ہمیشہ ڈانواں ڈول ہی رہیں گے، کیونکہ اس کے نزدیک صرف منفعت ہی زندگی کی بنیاد ہے۔ لہٰذا یہ طبعی بات ہے کہ زندگی سے اخلاقِ کریمہ اور روحانی قیمتوں کو نکال دیا گیا اور یوں زندگی مقابلے، جھگڑے، دشمنی اور استعمار کی بنیاد پر استوار ہو گئی۔ پس آج دنیا میں انسانوں میں پایا جانے والا روحانی بحران، دائمی بے چینی اور پھیلا ہوا شر اس مغربی تہذیب سے پیدا ہونے والے نتائج کی بہترین مثالیں ہیں۔ کیونکہ آج پوری دنیا پر یہی تہذیب چھائی ہوئی ہے اور اسی نے ان خطرناک نتائج کو پیدا کیا ہے اور یہ تہذیب آج پوری دنیا کے لیے خطرہ ثابت ہو رہی ہے۔

اگر ہم اس اسلامی تہذیب پر نظر ڈالیں، جو چھٹی صدی عیسوی سے لے کر اٹھارویں صدی عیسوی تک دنیا پر حکومت کرتی رہی، تو ہم یہ دیکھ سکتے ہیں کہ یہ تہذیب استعماری تہذیب نہیں تھی، بلکہ استعماریت اس کی طبیعت میں

بھی شامل نہ تھی۔ کیونکہ اس نے مسلمانوں اور غیر مسلموں میں کبھی فرق نہیں کیا۔ پس اپنے تمام مدتِ حکمرانی میں، ان تمام اقوام کو عدل کی ضمانت حاصل تھی، جو اس کے زیرِ سایہ تھیں۔ کیونکہ یہ ایک ایسی تہذیب ہے جو اُس روحانی بنیاد پر قائم ہے، جو تمام قیمتوں کو پورا کرتی ہے: یعنی مادی، روحانی، اخلاقی اور انسانی قیمتوں کو۔ عقیدہ کو اس تہذیب میں بنیادی وزن حاصل ہے۔ اس تہذیب کے نزدیک زندگی کا تصور اللہ تعالیٰ کے اوامر و نواہی کے مطابق چلنا ہے اور خوشی وسعادت کے معنی اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کا حصول ہے۔ پس یہ اسلامی تہذیب، پہلے کی طرح جب دنیا پر حکمرانی کرے گی تو دنیا کے تمام بحرانوں کے حل کے لیے کافی ہو گی اور پوری انسانیت کی خوشحالی کی ضمانت ہو گی۔

اسلامی نظام

اسلام ہی وہ دین ہے جسے اللہ تعالیٰ نے سیدنا محمد ﷺ پر اس لیے نازل فرمایا کہ اس کے ذریعے اُن تعلقات کو منظم کیا جائے، جو انسان کے اپنے خالق، اپنے نفس اور دوسرے انسانوں کے ساتھ ہیں۔ انسان کا اپنے خالق کے ساتھ تعلق عقائد اور عبادات پر مشتمل ہے، اپنے نفس کے ساتھ تعلق اخلاق، کھانے پینے اور لباس پر مشتمل ہے جبکہ دوسرے انسانوں کے ساتھ اس کا تعلق معاملات اور عقوبات پر مشتمل ہے۔ پس اسلام وہ دین (آئیڈیالوجی) ہے جو زندگی کے تما م مسائل و معاملات کے متعلق ہے۔ یہ کوئی خانقاہی دین نہیں اور نہ اس کا پاپائیت سے کوئی تعلق ہے، بلکہ یہ تو مذہبی اشرافیت (مذہبی آٹوکریسی) کو جڑ سے اکھاڑ پھینکتا ہے۔ اس لیے اسلام میں 'مذہبی لوگ' اور 'دنیاوی لوگ' کے نام کی گروہ بندی نہیں ہوتی، بلکہ وہ تمام افراد جو اسلام کو اختیار کرتے ہیں، مسلمان کہلاتے ہیں، اور دین کی نظر میں یہ سب برابر ہوتے ہیں۔ اس لیے اسلام میں دیندار اور دنیادار الگ الگ افراد نہیں ہوتے۔ رُوحانی پہلو سے مراد یہ ہے کہ تمام اشیاء اللہ تعالیٰ کی مخلوق ہیں اور وہی پوری کائنات کے تمام امور کی تدبیر کرتا ہے۔ کیونکہ انسان جب کائنات، حیات اور خود انسان پر اور اپنے ماحول و متعلقات پر گہری نظر ڈالے تو وہ لازمی طور پر اس نتیجے پر پہنچتا ہے کہ تمام اشیاء ناقص، عاجز اور محتاج ہیں۔ جو اس اَمر کی قطعی دلیل ہے کہ یہ اشیاء کسی خالق کی مخلوق ہیں اور وہی ان سب کے امور کی تدبیر کرتا ہے۔ انسان کو زندگی کے میدان میں چلنے کے لیے ایک نظام کی ضرورت ہے، جس سے وہ اپنی جبلّتوں اور عضویاتی حاجات کو منظم کر سکے۔ انسان عاجز اور محدود ہونے کی وجہ سے یہ نظام خود نہیں بنا سکتا۔ کیونکہ اس نظام کو بنانے کے لیے انسان کا فہم تفاوت، اختلاف اور تضاد سے دوچار ہوتا رہتا ہے۔ لہٰذا یہ ایک ایسا متناقض نظام ہوگا جو انسان کی بد بختی پر منتج ہوگا۔ اس لیے نظام لازمی طور پر اللہ کی طرف سے ہونا چاہیے۔ انسان پر لازم ہے کہ وہ اپنے تمام اعمال کو اللہ تعالیٰ کے نظام کے مطابق سرانجام دے۔ تاہم اگر اس نظام پر چلنے کی وجہ منفعت ہو، اور اس پر چلنے کی بنیاد یہ نہ ہو کہ یہ نظام اللہ کی طرف سے ہے، تو اس میں روحانی پہلو ناپید ہوگا۔ اس لیے انسان کے لیے ضروری ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ

اپنے تعلق کے ادراک کی بنیاد پر زندگی میں اپنے اعمال کو اللہ تعالیٰ کے اوامر ونواہی کے مطابق منظم کرے، تاکہ اس کے اعمال میں روح موجود ہو۔ کیونکہ روح کا معنی انسان کا اللہ کے ساتھ تعلق کا ادراک ہے اور روح کے مادے کے ساتھ امتزاج کے معنی اعمال کی انجام دہی کے وقت اللہ کے ساتھ تعلق کا ادراک کرنا ہے۔ اسی لیے انسان اللہ کے ساتھ اس تعلق کے ادراک کی وجہ سے اپنے اعمال کو اللہ تعالیٰ کے اوامر ونواہی کے مطابق سرانجام دیتا ہے، پس عمل مادہ ہے، اور اس عمل کی انجام دہی کے وقت اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق کا ادراک روح ہے۔ چنانچہ عمل کو اللہ تعالیٰ کے اوامر ونواہی کے مطابق سرانجام دینا اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق کے ادراک کی وجہ سے ہوتا ہے۔ یہی مادہ اور روح کا آپس میں ملنا ہے۔ اسی لیے اگر ایک غیر مسلم اپنے اعمال کو قرآن وسنت سے اخذ شدہ احکامِ شرعیہ کے مطابق سرانجام دیتا ہے تو اس میں کوئی روح موجود نہیں اور نہ ہم اسے روح اور مادہ کا امتزاج کہیں گے۔ چونکہ وہ اسلام کو مانتا ہی نہیں، اس لیے اسے اللہ کے ساتھ تعلق کا ادراک ہی نہیں۔ بلکہ اس نے احکامِ شرعیہ کو بطورِ نظام اس لیے اختیار کیا کہ وہ اسے پسند آیا، اور اس نے اپنے اعمال کو اس کے ذریعے منظم کیا۔ اس کے برخلاف ایک مسلمان کا اپنے اعمال کو اللہ تعالیٰ کے اوامر ونواہی کے مطابق سرانجام دینا اللہ تعالیٰ کے ساتھ اپنے تعلق کے ادراک کی وجہ سے ہے اور اللہ تعالیٰ کے اوامر ونواہی کے مطابق اپنے اعمال کو سرانجام دینے سے اس کا مقصد اللہ تعالیٰ کی رضا کا حصول ہے، صرف نظام سے فائدہ اٹھانا نہیں۔ اس لیے اشیاء میں روحانی پہلو کا وجود ضروری ہے اور اعمال کی انجام دہی کے وقت روح کا موجود ہونا لازمی ہے۔ اشیاء کے روحانی پہلو سے مراد اشیاء کا ایک خالق کی مخلوق ہونا ہے۔ یعنی مخلوق کا خالق کے ساتھ تعلق۔ اور روح اس تعلق کے ادراک کو کہتے ہیں، یعنی انسان کا اپنے خالق کے ساتھ تعلق کا ادراک۔ روحانی پہلو، روح اور روحانیت کا صرف یہی صحیح مفہوم ہے۔ اس کے علاوہ تمام تصورات بالکل غلط ہیں۔ کائنات، حیات اور انسان پر گہری اور روشن نظر ہی صحیح نتائج تک پہنچاتی ہے اور اسی کے نتیجے میں یہ صحیح مفہوم حاصل ہوا۔

بعض مذاہب کا نظریہ ہے کہ کائنات کے دو اجزاء ہیں، جس میں سے ایک مرئی ہے اور دوسرا غیر مرئی، اسی طرح انسان میں روحانی زُہد بھی ہے اور مادی خواہشات بھی اور زندگی میں ایک روحانی پہلو ہے اور ایک مادی پہلو۔ وہ یہ گمان کرتے ہیں کہ کائنات کا مرئی جزو غیر مرئی جزو کی ضد ہے، روحانی زُہد جسمانی خواہشات سے میل نہیں کھاتا اور اسی طرح مادہ روح سے الگ ہے۔ اُن کے خیال میں یہ دونوں پہلو ایک دوسرے سے جُدا جُدا ہیں کیونکہ ان کی طبیعت میں بنیادی طور پر تعارض پایا جاتا ہے۔ لہٰذا ان دونوں کا اکٹھا ہونا ممکن نہیں۔ اور ان میں سے ایک کی زیادتی دوسرے کی کمی کا باعث بنتی ہے۔ چنانچہ آخرت کے طلب گار کو روحانی پہلو کو ترجیح دینا چاہیے۔ اسی بنیاد پر عیسائیت میں دو اتھارٹیوں کے تصور نے جنم لیا۔ روحانی اتھارٹی، اور زمانی (دنیاوی) اتھارٹی۔ یعنی ''قیصر کا قیصر کو دو اور اللہ کا اللہ کو دو''۔ روحانی اتھارٹی کے حامل افراد رجالِ دین (مذہبی طبقہ) تھے۔ یہ لوگ دنیاوی اتھارٹی کے حصول کی بھرپور کوشش کرتے تھے، تاکہ زندگی میں لوگوں پر روحانی اتھارٹی مسلط کر سکیں۔ جس کے نتیجے میں دنیاوی اتھارٹی اور روحانی اتھارٹی کے مابین جنگ شروع ہوئی اور جس نے بالآخر رجالِ دین کو روحانی اتھارٹی تک محدود کر دیا۔ چنانچہ اس کے بعد انہوں نے دنیاوی اتھارٹی میں دخل دینا بند کر دیا اور یوں دین کو دنیاوی امور سے الگ کر دیا گیا۔ کیونکہ ایسا کرنا پاپائیت ہے۔ دین و دنیا کی یہ جدائی ہی سرمایہ دارانہ آئیڈیالوجی کا عقیدہ ہے۔ یہی مغربی تہذیب کی اساس ہے، اور یہی وہ فکری قیادت ہے، استعماری مغرب جس کا علمبردار ہے اور جس کی طرف پوری دنیا کو دعوت دیتا ہے۔ مغرب نے اسے اپنی ثقافت کا بنیادی ستون بنایا ہے اور اپنے اس عقیدہ کے ذریعے وہ مسلمانوں کے عقیدہ کو متزلزل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ اسلام کو عیسائیت پر قیاس کرتا ہے۔ چنانچہ جو شخص بھی دنیاوی امور سے دین کی جدائی یا دین کی ریاست یا سیاست سے جدائی کی دعوت کا علمبردار ہے، وہ دراصل اس اجنبی فکری قیادت کا تابع اور پیروکار ہے۔ وہ استعمار کا ایجنٹ ہے، خواہ اچھی نیت سے ہو یا بدنیتی سے۔ ایسا شخص یا تو اسلام سے بالکل ناواقف ہے یا اسلام کا دشمن ہے۔

اسلام کا یہ نظریہ ہے کہ وہ تمام اشیاء، جن کا حواس ادراک کرتے ہیں، مادہ ہیں۔ اشیاء کے روحانی پہلو سے مراد یہ ہے کہ وہ سب کی سب ایک خالق کی مخلوق ہیں۔ روح سے مراد انسان کا اللہ تعالیٰ کے ساتھ اپنے تعلق کا ادراک ہے۔ اس لیے روحانی پہلو مادی پہلو سے الگ چیز نہیں، اور نہ انسان کے اندر روحانی زُہد اور مادی میلانات پائے جاتے ہیں۔ بلکہ انسان کے اندر عضویاتی حاجات اور جبلتیں ہیں۔ ان عضویاتی حاجات کو پورا کرنا لازمی ہے۔ جبلتوں میں سے ایک 'جبلت تدین' بھی ہے، یعنی ایک خالقِ مدبر کا محتاج ہونا۔ یہ انسان کے اندر پائی جانے والی فطرتی عِجز سے پیدا ہوتی ہے۔ ان جبلتوں کے پورا کرنے کو نہ روحانی پہلو کہا جاتا ہے نہ مادی۔ کیونکہ یہ تو بس ضروریات کو پورا کرنا ہے۔ البتہ ان عضویاتی حاجات اور جبلتوں کو اللہ کے نظام کے مطابق اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق کا ادراک کرتے ہوئے پورا کیا جائے، تو یہ روح ہے۔ اگر انہیں کسی نظام کے بغیر، یا اللہ کے نظام کے علاوہ کسی اور نظام کے مطابق پورا کیا جائے، تو یہ جبلتوں اور عضویاتی حاجات کو صرف مادی طور پر پورا کرنا ہو گا، جو انسان کی بد بختی پر منتج ہو گا۔ چنانچہ جبلتِ نوع کو بغیر کسی نظام کے، یا اللہ کے نظام کے علاوہ کسی اور نظام کے مطابق پورا کیا جائے، تو یہ انسان کی بد بختی کا سبب ہو گا۔ اگر اس جبلت کو نکاح کر کے اسلامی نظام کے ذریعے پورا کیا جائے، تو یہ انسان کے لیے تسکین اور اطمینان کا باعث بنے گا۔ اسی طرح انسان اگر جبلتِ تدین کو بغیر کسی نظام کے، یا اللہ کے نظام کے علاوہ کسی اور نظام کے مطابق، بتوں یا انسانوں کی عبادت کے ذریعے پورا کرے، تو یہ شرک اور کفر ہو گا۔ اور اگر اسے اسلامی احکامات کے مطابق پورا کرے تو یہ عبادت ہو گی۔ اس لیے اشیاء میں روحانی پہلو کا لحاظ رکھنا ضروری ہے۔ تمام اعمال کو اللہ تعالیٰ کے اوامر و نواہی کے مطابق، اس کے ساتھ تعلق کا ادراک کرتے ہوئے، یعنی روح کے ساتھ سر انجام دینا چاہیے۔ چنانچہ ایک عمل میں دو چیزیں نہیں ہیں، بلکہ یہ ایک ہی چیز یعنی عمل ہے۔ عمل کا صرف مادی ہونا یا روح کے ساتھ ہونا، عمل کا ایک وصف ہے۔ یہ صرف عمل کو بجالانے سے پیدا نہیں ہوتا، بلکہ اس عمل کو اسلامی احکامات کے مطابق سر انجام دینے سے پیدا ہوتا ہے۔ چنانچہ اگر مسلمان جنگ میں اپنے دشمن کو قتل کرے تو اِسے جہاد کہا جاتا ہے اور اُسے اِس عمل کا ثواب ملتا ہے۔ کیونکہ یہ عمل اسلامی احکامات کے عین مطابق ہے۔ اور اگر مسلمان کسی بے گناہ مسلمان یا غیر مسلم کو ناحق قتل کرے، تو یہ بہت بڑا

جرم ہے، جس کی اسے سزا ملے گی۔ کیونکہ اس کا یہ عمل اللہ تعالیٰ کے اوامر ونواہی کے خلاف ہے۔ عمل تو دونوں جگہ ایک ہی ہے، یعنی قتل اور کرنے والا بھی ایک ہی انسان ہے۔ لیکن قتل اُس وقت عبادت بن جاتا ہے، جب اس میں روح ہو، اور قتل اُس وقت جرم بن جاتا ہے، جب بغیر روح کے ہو۔ لہٰذا مسلمان پر لازم ہے کہ وہ اپنے اعمال کو روح کا لحاظ کرتے ہوئے سرانجام دے۔ مادہ اور روح کو ملانا کوئی امکانی امر نہیں، بلکہ یہ ایک فرض ہے۔ مادے کا روح سے جدا ہونا جائز نہیں۔ یعنی کوئی بھی عمل اللہ تعالیٰ کے اوامر ونواہی اور اس کے ساتھ تعلق کے ادراک کے بغیر نہیں ہونا چاہیے۔ لہٰذا ہر اس چیز کو ختم کرنا لازمی ہے، جس سے روحانی پہلو کی مادی پہلو سے جدائی نظر آتی ہو۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام میں کوئی مذہبی طبقہ (رجالِ دین) نہیں ہوتا، اور نہ اس میں ملائیت (تھیوکریسی) کے نام پر کوئی دینی اقتدار کا وجود ہے، اور نہ ہی دین سے الگ دنیاوی اقتدار کا کوئی تصور موجود ہے۔ بلکہ اسلام وہ دین ہے جس کے اندر سے ریاست جنم لیتی ہے۔ ریاست سے متعلق احکام شرعیہ کی بھی وہی حیثیت ہے، جو نماز کے احکام کی ہے۔ ریاست کا قیام ہی اسلامی احکامات کو نافذ کرنے اور اسلامی دعوت کو دنیا کے سامنے پیش کرنے کا طریقہ ہے۔ چنانچہ ہر اس چیز کو ختم کرنا واجب ہے، جس سے دین کے روحانیت میں محدود ہونے، یا سیاست اور حکومت سے دین کے جدا ہونے کا احساس ہوتا ہو۔ لہٰذا اُن اداروں کو ختم کرنا چاہیے، جو صرف روحانی پہلوؤں کی نگرانی کرتے ہیں۔ اس لیے شعبۂ مساجد کو ختم کرنا چاہیے اور مساجد شعبۂ تعلیم کے تابع ہونے چاہئیں۔ اسی طرح شرعی عدالتوں اور سول عدالتوں کی تقسیم کو ختم کرنا چاہیے۔ صرف ایک ہی عدالت ہونی چاہیے، جو صرف اسلامی احکامات کے مطابق فیصلہ کرے۔ کیونکہ اسلام میں اقتدار ایک ہی ہے۔

اسلام عقیدہ بھی ہے اور نظام بھی۔ عقیدہ اللہ تعالیٰ، فرشتوں، کتابوں، رسولوں اور روزِ آخرت اور قضاوقدر کے خیر وشر کے مِن جانب اللہ ہونے پر ایمان کو کہتے ہیں۔ اسلام نے عقیدہ کی بنیاد عقل پر رکھی ہے۔ یہ ان باتوں پر ایمان ہے جن کا عقل ادراک کر سکتی ہے، جیسے اللہ پر ایمان، محمدا کی نبوت پر ایمان، قرآنِ کریم پر ایمان۔ اور یہ ایسی

چیزوں پر ایمان بھی ہے، جن کا عقل ادراک نہیں کر سکتی، مثلاً قیامت کا دن، ملائکہ، جنت، جہنم وغیرہ۔ ان مغیبات پر ایمان کی بنیاد یہ ہے کہ ان کے مآخذ، یعنی قرآن اور متواتر احادیث، عقل سے ثابت ہیں۔ اسلام نے عقل ہی کو تکلیف کی بنیاد بنایا ہے۔

نظام وہ شرعی احکامات ہیں، جو انسان کے معاملات کو منظم کرتے ہیں۔ اسلام کا نظام تمام معاملات کا احاطہ کرتا ہے۔ البتہ اسلام نے ان تمام معاملات کا احاطہ عام معانی اور عام شکل کے ساتھ کیا ہے اور تفصیلات کو اِن عام معانی سے مُستَنبِط کرنے کے لیے چھوڑ دیا ہے، کہ نافذ کرتے وقت ان تفصیلات کو اخذ کر لیا جائے۔ چنانچہ قرآنِ کریم اور حدیث شریف، انسان کے معاملات کو بحیثیتِ انسان حل کرنے کے لیے عام معانی پر مشتمل ہیں۔ ان عام معانی سے تفصیلی احکامات کو اخذ کرنے کا کام اسلام نے مجتہدین پر چھوڑا ہے، اور وہ اِن معانی کی روشنی میں اُن مشکلات کا حل نکالتے ہیں، جو زمانے کے گزرنے اور جگہوں کی تبدیلی سے پیدا ہوتی ہیں۔

مشکلات کو حل کرنے کے لیے اسلام کا ایک ہی طریقہ ہے۔ وہ مجتہد کو دعوت دیتا ہے کہ وہ پہلے نئی پیدا شدہ مشکل کی اچھی طرح تحقیق کرے تاکہ اسے سمجھ لے۔ پھر اس مشکل سے متعلقہ شرعی نصُوص کا مطالعہ کرے اور پھر ان نصُوص سے اس مشکل کا حل نکالے۔ یعنی اس مسئلہ کے لیے شرعی دلائل میں سے شرعی حکم مستنبط کرے اور اس کے علاوہ کسی اور راستے کو بالکل اختیار نہ کرے۔ وہ جب کسی مسئلے کا جائزہ لے تو صرف یہ سمجھ کر اس کا جائزہ لے کہ یہ ایک انسانی مسئلہ ہے، نہ کہ یہ کوئی اقتصادی یا اجتماعی یا حکومتی مسئلہ ہے۔ بلکہ یہ ایک ایسا مسئلہ ہے جس کے بارے میں حکمِ شرعی کی ضرورت ہے، تاکہ اس کے بارے میں اللہ کا حکم معلوم ہو سکے۔

حکمِ شرعی

بندوں کے افعال سے متعلق شارع کے خطاب کو حکمِ شرعی کہتے ہیں۔ یہ خطاب کبھی قطعی الثبوت ہوتا ہے جیسے قرآنِ کریم اور متواتر احادیث، یا یہ ظنّی الثبوت ہوتا ہے جیسے غیر متواتر احادیث۔ اگر یہ خطاب قطعی ہو تو دیکھا جائے گا کہ آیا یہ قطعی الدلالہ ہے یا نہیں۔ اگر یہ قطعی الدلالہ بھی ہو تو اس میں موجود حکم قطعی حکم ہوگا۔ مثلاً فرض نمازوں کی تمام رکعتیں، کیونکہ یہ متواتر احادیث کے ذریعے منقول ہیں۔ اسی طرح سود کی حُرمت، چور کا ہاتھ کاٹنا، زانی کو سنگسار کرنا، یہ سب قطعی حکم ہیں۔ ان کا درست ہونا یقینی ہے۔ ان میں ایک قطعی رائے کے سوا کوئی دوسری رائے ہے ہی نہیں۔

اگر شارع کا خطاب ثبوت کے اعتبار سے تو قطعی ہو، لیکن دلالت کے اعتبار سے ظنی ہو تو اس میں موجود حکم بھی ظنی ہوگا، مثلاً جزیہ کی آیت، کہ یہ اپنے ثبوت کے اعتبار سے تو قطعی ہے لیکن دلالت کے لحاظ سے ظنی ہے۔ اور اس ظن کی وجہ سے احناف شرط لگاتے ہیں کہ اس کو جزیہ ہی کہا جائے گا، اور جزیہ دیتے وقت جزیہ دینے والے کی محکومی کا اظہار بھی ضروری ہے۔ لیکن شوافع یہ شرط نہیں لگاتے۔ بلکہ ان کے نزدیک اس کو دوگنی زکوٰۃ کے نام سے بھی وصول کیا جاسکتا ہے اور دینے والے کی محکومی کے اظہار کی بھی کوئی ضرورت نہیں۔ بلکہ اس کا اسلامی احکامات کے سامنے جھکنا ہی کافی ہے۔

اگر شارع کا خطاب ظنی الثبوت ہو، جیسے غیر متواتر احادیث، تو اس میں موجود حکم بھی ظنی ہوگا، اس بات سے قطع نظر کہ وہ اپنی دلالت کے اعتبار سے قطعی ہے، مثلاً شوال کے چھ روزے یا اس کی دلالت ظنی ہے، مثلاً زمین کو کرایہ پر دینے کی ممانعت، کیونکہ یہ سنت سے ثابت ہے۔

شارع کے خطاب سے حکمِ شرعی کو سمجھنا ہو تو درست اجتہاد ہی اس کا ذریعہ ہے۔ پس مجتہدین کے اجتہاد سے شرعی حکم کا اظہار ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر مجتہد کے لیے اللہ کا حکم وہ ہوتا ہے، جسے وہ اجتہاد کے ذریعے معلوم کرتا ہے اور مجتہد کو اُس کے صحیح ہونے کا غالب گمان ہوتا ہے۔

لہٰذا اگر کسی مکلف کے اندر کسی مسئلے یا تمام مسائل پر اجتہاد کرنے کی صلاحیت پائی جائے اور وہ اجتہاد کرے اور ایک حکم تک پہنچ جائے، تو اس صورت میں سب کا اتفاق ہے کہ اس مجتہد کے لیے اپنے ظن کے بر خلاف کسی اور مجتہد کی تقلید کرنا جائز نہیں۔ اس کے لیے اپنے ظن کو چھوڑنا بھی جائز نہیں، ماسوائے ان چار صورتوں کے:

اول: جب اس پر یہ ظاہر ہو جائے کہ جس دلیل کو اس نے اپنے اجتہاد کی بنیاد بنایا وہ کمزور ہے اور دوسرے مجتہد کی دلیل اس کی دلیل سے زیادہ قوی ہے۔ اس حالت میں اس پر واجب ہے کہ وہ اس حکم کو چھوڑ دے جس پر وہ اپنے اجتہاد سے پہنچا تھا اور قوی دلیل پر مبنی حکم کو اختیار کر لے۔

دوم: جب ایک مجتہد پر یہ بات ظاہر ہو جائے کہ دوسرا مجتہد ربط میں اس سے بڑھ کر ہے یا اسے حقیقت سے زیادہ آگاہی حاصل ہے اور شرعی ادِلّہ سے متعلق اس کا فہم زیادہ قوی ہے یا وہ سمعی دلائل (شرعی مصادر) سے زیادہ مطلع ہے؛ تو اس صورتِ حال میں اِس کے لیے جائز ہے کہ وہ اُس حکم کو ترک کر دے جس پر وہ خود اجتہاد کے ذریعے پہنچا اور اس مسئلے میں اس مجتہد کی تقلید کر لے جس کا اجتہاد اس کے نزدیک اس کے اپنے اجتہاد سے زیادہ قابلِ وثوق ہے۔

سوم: جب کوئی رائے مسلمانوں کو جمع کرنے کا باعث ہو، جس میں مسلمانوں کی مصلحت ہو، تو اس حالت میں ایک مجتہد کے لیے جائز ہے کہ وہ اس رائے کو ترک کر دے جس پر اس کے اجتہاد نے اسے پہنچایا اور اس حکم کو اختیار کر لے جو مسلمانوں کو جمع کرنے کا باعث ہو، جیسا کہ بیعت کے وقت عثمانضنے کیا۔

چہارم: اگر خلیفہ کسی شرعی حکم کی تبنی کرے اور خلیفہ کا یہ حکم اُس حکم کے مخالف ہو جس تک وہ مجتہد اپنے اجتہاد کے ذریعے پہنچا۔ اس صورت میں مجتہد پر واجب ہے کہ وہ اس رائے پر عمل ترک کر دے جس پر وہ اپنے اجتہاد کے ذریعے پہنچا اور اس حکم پر عمل کرے جس کی امام (خلیفہ) نے تبنی کی۔ کیونکہ اس بات پر صحابہ کا اِجماع ہے کہ ((اَمرُ الْاِمَامِ یَرْفَعُ الْخِلافَ)) ''امام کا حکم اختلاف کو دور کرتا ہے''، اور یہ کہ امام کا حکم تمام مسلمانوں پر نافذ ہوتا ہے۔

کوئی ایسا شخص، جس کے اندر اجتہاد کی صلاحیت تو پائی جاتی ہے، لیکن وہ خود اجتہاد نہیں کرتا، بلکہ کسی اور مجتہد کی تقلید کرتا ہے، تو یہ اس کے لیے جائز ہے۔ کیونکہ اس پر صحابہ کا اجماع ہے کہ کسی مجتہد کے لیے دوسرے مجتہد کی تقلید کرنا جائز ہے۔

جس شخص کے اندر اجتہاد کی صلاحیت نہ ہو، وہ مُقَلِّد ہے۔ مقلد کی دو قسمیں ہیں: مُتَّبِع اور عامی۔ متبع وہ ہے جس نے اجتہاد کے معتبر علوم میں سے بعض علوم حاصل کیے ہوں۔ اور وہ دلیل کی معرفت کے بعد کسی مجتہد کی تقلید کرے۔ اس متبع کے لیے اللہ کا حکم مجتہد کا وہ قول ہے، جس کی یہ اتباع کرتا ہے۔ عامی شخص وہ ہے جس نے اجتہاد کے لیے معتبر علوم میں سے کوئی علم حاصل نہ کیا ہو۔ پس وہ دلیل کو سمجھے بغیر مجتہد کی تقلید کرے گا۔ اس عامی پر لازم ہے کہ وہ مجتہدین کے قول کی تقلید کرے اور اُن احکامات کو اختیار کرے جنہیں مجتہدین نے مُستَنبِط کیا ہو۔ کیونکہ اس کے حق میں حکمِ شرعی وُہی ہے، جس کا اس مجتہد نے استنباط کیا ہو۔ چنانچہ حکم شرعی وہ حکم ہے، جسے ایسے مجتہد نے مستنبط کیا ہو، جو اجتہاد کی صلاحیت رکھتا ہو۔ اور یہ اس مجتہد کے حق میں اللہ کا حکم ہوتا ہے۔ اس کے مخالف عمل یا اسے چھوڑ کر دوسرے مجتہد کی اتباع اس کے لیے جائز نہیں، ماسوائے ان حالتوں میں جو اوپر بیان کی گئیں۔ اسی طرح یہ اُس شخص کے حق میں بھی اللہ کا حکم ہے، جو اِس مجتہد کی تقلید کرتا ہے۔ اور اس کے لیے اِس کے مخالف عمل کرنا جائز نہیں۔

مقلد جب نئے مسائل میں سے کسی ایک مسئلہ میں کسی مجتہد کی تقلید کرے اور اس کے قول پر عمل شروع کر دے تو اب اس حکم میں اس مجتہد کے اجتہاد کو چھوڑ کر کسی اور اجتہاد کی طرف رجوع کرنا اس کے لیے جائز نہیں، ماسوائے وہ ایسا کسی دلیل کی بنیاد پر کرے۔ البتہ وہ اس مسئلے کے علاوہ کسی دوسرے مسئلے میں کسی بھی مجتہد کی تقلید کر سکتا ہے کیونکہ یہ بات اجماعِ صحابہ سے ثابت ہے کہ مقلد مختلف مسائل میں مختلف علماء کی رائے طلب کر سکتا ہے۔

جب ایک مقلد ایک معین مذہب پر چلنا شروع کرے، مثلاً وہ کہہ دے کہ میں امام شافعی کے مذہب پر ہوں، تو اس کی یہ تفصیل ہے: ہر وہ مسئلہ، جس پر اس نے اس مذہب کے مطابق عمل کیا، جس کا وہ مقلد ہے، تو اس کے لیے اس مسئلہ میں کسی دوسرے مذہب کی تقلید کرنا بالکل جائز نہیں۔ اور وہ مسائل جس میں اُس نے اِس مذہب کے مطابق عمل نہیں کیا، ان میں وہ کسی بھی دوسرے مجتہد کی رائے اختیار کر سکتا ہے۔

احکامِ شرعیہ کی اقسام

احکامِ شرعیہ یہ ہیں: فرض، حرام، مَندُوب، مکروہ اور مُباح۔ شرعی حکم یا تو کسی فعل کو کرنے کے بارے میں خطاب ہو گا، یا فعل کو ترک کرنے کے بارے میں۔ پس اگر اس خطاب میں کسی فعل کے کرنے کی طلب موجود ہو او ر یہ طلب، طلبِ جازِم (قطعی طلب) ہو، تو یہ فعل یا عمل فرض اور واجب ہو گا۔ فرض اور واجب کا ایک ہی معنی ہے۔ اگر اس خطاب میں کسی فعل کے کرنے کی طلب غیرِ جازم ہو، تو یہ عمل مندوب ہو گا۔ اگر خطاب میں کسی فعل کے ترک کرنے کی طلب موجود ہو اور یہ طلب جازم (قطعی) ہو تو اس عمل کو حرام اور محظور کہتے ہیں۔ ان دونوں کا بھی ایک ہی معنی ہے۔ اگر یہ طلب غیر جازم ہو تو یہ مکروہ ہوتا ہے۔ لہٰذا فرض اور واجب وہ عمل ہے جس کے کرنے والے کی تعریف کی جائے اور نہ کرنے والے کی مذمت کی جائے، یا اسے چھوڑنے والا سزا کا مستحق قرار پائے۔ حرام وہ عمل ہے جس کے کرنے والے کی مذمت کی جائے اور چھوڑنے والے کی تعریف کی جائے یا کرنے والا سزا کا مستحق ہو۔ مندوب وہ عمل ہے، جس کے کرنے والے کی تعریف کی جائے، اور چھوڑنے والے کی مذمت نہ کی جائے۔ یعنی کرنے والا ثواب کا مستحق ہو اور چھوڑنے والا سزا کا مستحق نہ ہو۔ مکروہ وہ عمل ہے جس کے چھوڑنے والے کی تعریف کی جائے، یا جس فعل کا چھوڑنا اس فعل کو کرنے سے بہتر ہو۔ مباح وہ عمل ہے کہ جس کے متعلق سمعی دلیل یہ ظاہر کرے یہاں شارع کا خطاب انسان کو یہ اختیار دے رہا ہے کہ خواہ وہ یہ عمل کرے یا نہ کرے۔

سُنَّت

لغت میں سنت کے معنی ہیں: طریقہ۔ تاہم جہاں تک شریعت کا تعلق ہے، تو اس میں سنت سے مراد وہ اعمال ہیں جو بطورِ نفل رسول اللہ ﷺ سے منقول ہیں، مثلاً سنت رکعتیں۔ انہیں فرض سے فرق کرنے کے لیے سنت کہا جاتا ہے۔ انہیں سنت کہنے کا یہ مطلب نہیں کہ یہ رکعتیں نبی اکی جانب سے ہیں اور فرض اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہیں۔ بلکہ سنت اور فرض دونوں اللہ کی جانب سے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ تو صرف اللہ تعالیٰ کی طرف سے مبلغ (پیامبر) ہیں۔ اور وہ اپنی خواہشات سے کچھ نہیں بولتے، بلکہ ان کا کہا سب اللہ کی طرف سے وحی ہوتا ہے۔ پس اگرچہ سنت نبی اسے ہی منقول ہے لیکن یہ آپ اسے بطورِ نفل منقول ہے، اس لیے اسے سنت کہا جاتا ہے۔ جس طرح کہ فرض آپ اسے بطورِ فرض منقول ہے، اس لیے اسے فرض کہا جاتا ہے۔ چنانچہ فجر کی دو رکعتیں بطورِ فرض آپ اسے متواتر روایات کے ذریعے منقول ہیں، اور فجر کی دو سنتیں بطورِ سنت آپ اسے متواتر روایات کے ذریعے منقول ہیں۔ اور یہ دونوں (فرض اور سنت) اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہیں، رسول اللہ ﷺ کی طرف سے نہیں۔ عبادات سے متعلق اَمر (حکم) فرض یا نفل ہوتا ہے۔ جبکہ عبادات کے علاوہ دیگر معاملات میں کوئی اَمر (حکم) فرض یا مندوب یا مباح ہوتا ہے۔ نفل اور مندوب ایک ہی چیز ہے، اسے نفل کہا جاتا ہے اور اس پر لفظ سنت کا اطلاق بھی کیا جاتا ہے۔

اسی طرح سنت کا اطلاق رسول اللہ ﷺ سے صادر ہونے والے اُن شرعی ادِلَّہ پر بھی ہوتا ہے، جو قرآن کے علاوہ ہیں۔ اس میں آپ اکے اقوال، آپ اکے افعال، اور آپ کا اقرار (تقاریر) یعنی آپ اکا سکوت (خاموشی) شامل ہیں۔

رسول اللہ ﷺ کے افعال کو بطور اسوۂ اختیار کرنا

رسول اللہ ﷺ نے جو افعال سرانجام دیئے ان کی دو اقسام ہیں: ایک جبلّی افعال، دوسرے غیر جبلی افعال۔ جہاں تک جبلی افعال کا تعلق ہے، جیسے اٹھنا، بیٹھنا، کھانا، پینا وغیرہ، تو ان افعال کے آپ اور امت کے لیے مباح ہونے میں کسی کو اختلاف نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ یہ افعال مندوبات میں داخل نہیں۔

جہاں تک غیر جبلی افعال کا تعلق ہے، تو یہ یا تو رسول اللہ ﷺ کے ساتھ خاص ہوں گے یعنی یہ کسی دوسرے کے لیے نہیں ہوں گے، اور یا پھر یہ افعال آپ اکے ساتھ مخصوص نہیں ہوں گے۔ اگر یہ افعال آپ اکے ساتھ مخصوص ہوں، جیسے صومِ وصال (دن رات روزہ رکھنا) کا آپ اکے لیے مباح ہونا یا چار سے زیادہ عورتوں سے نکاح کا آپ کے لیے جائز ہونا وغیرہ، تو یہ افعال صرف آپ اکے لیے ہیں۔ ان افعال کا کرنا ہمارے لیے جائز نہیں۔ ان افعال کا آپ اکے ساتھ مخصوص ہونا اجماعِ صحابہؓ سے ثابت ہے۔ لہٰذا ان افعال کو بطورِ اسوۂ اختیار کرنا جائز نہیں۔

جو فعل آپ نے ہمارے لیے بیان کیا ہو، تو اس فعل کے دلیل ہونے میں کوئی اختلاف نہیں۔ یہ بیان یا تو آپ اکے صریح قول کی صورت میں ہوگا، جیسے آپ نے ارشاد فرمایا: **((صَلُّوْا كَمَا رَاَيْتُمُوْنِيْ اُصَلِّي))** ''نماز اس طرح پڑھو جیسا کہ تم مجھے پڑھتے ہوئے دیکھتے ہو۔'' اور **((خُذُوْا عَنِّيْ مَنَاسِكَكُم))** ''مجھ سے اپنے مناسک (حج وغیرہ کا طریقہ) سیکھو'' یہ اس بات کی دلیل ہے کہ آپ اکا فعل ہمیں بتانے کے لیے ہے، تاکہ ہم آپ اکی اتباع کریں۔ یا پھر ہو سکتا ہے آپ اکا بیان کرنا صریح قول کی صورت میں نہ ہو، بلکہ عمل کے قرینے کے ذریعے ہو۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کی بنیاد پر **(فَاقْطَعُوْا اَيْدِيَهُمَا)** ''ان دونوں کا ہاتھ کاٹ دو'' چور کا ہاتھ کلائی سے کاٹنا۔ قول یا قرائنِ احوال کے ذریعے آپ اکا کسی فعل کو سمجھانے کا وہی حکمِ شرعی ہوتا ہے جو کہ اس فعل کا ہے جس کی وضاحت کی جا رہی ہو۔

آپ اکے وہ افعال، جن میں کوئی ایسی چیز موجود نہ ہو جو اس بات پر دلالت کرے کہ آپ کا یہ فعل ہمیں سمجھانے کے لیے ہے، نہ نفی کی صورت میں اور نہ ہی اثبات کی صورت میں، تو دیکھا جائے گا کہ ان افعال میں (اللہ سے) قربت کا قصد ہے یا نہیں۔ اگر ان افعال میں (اللہ کی) قربت کا قصد ہو، تو وہ مندوب میں داخل ہوں گے۔ اِن افعال کی انجام دہی پر انسان کو ثواب ملے گا اور ترک کرنے پر سزا نہیں ہو گی، مثلاً چاشت (ضحی) کی نفل نماز۔ اگر ان افعال میں قربت کا قصد نہ ہو، تو یہ افعال مباحات میں شمار ہوں گے۔

احکامِ شرعیہ کی تبنی

صحابہؓ کے زمانے میں مسلمان بذاتِ خود کتاب وسنت سے شرعی احکامات کو اخذ کیا کرتے تھے اور قاضی لوگوں کے مابین جھگڑوں کا فیصلہ کیا کرتے تھے، وہ ہر پیش آنے والے واقعہ سے متعلق شرعی احکامات کا بذاتِ خود استنباط کرتے تھے۔ حکمران بھی، امیر المؤمنین سے لے کر والیوں تک نیز دیگر حکام، حکمرانی کے دوران پیش آنے والے کسی بھی مشکل کو حل کرنے کے لیے بذاتِ خود شرعی احکامات کو مستنبط کیا کرتے تھے۔ ابو موسیٰ اشعری اور شریح دونوں قاضی تھے۔ یہ دونوں احکامات کا استنباط کیا کرتے تھے اور اپنے اجتہاد سے فیصلہ کرتے تھے۔ معاذ بن جبل رسول اللہ ﷺ کے عہدِ مبارک میں والی تھے۔ وہ بھی خود احکامات کا استنباط کیا کرتے تھے اور اپنی ولایہ میں اپنے اجتہاد کے مطابق فیصلے کرتے تھے۔ اسی طرح ابو بکر اور عمر بھی اپنی خلافت میں احکامات کا بذاتِ خود استنباط کرتے تھے اور اپنے اپنے استنباط کردہ احکامات کے مطابق لوگوں پر حکومت کیا کرتے تھے۔ اسی طرح معاویہ اور عمرو بن العاص والی تھے، یہ دونوں بھی احکام کا استنباط کرتے تھے اور اپنی اپنی ولایہ میں اپنے اجتہاد سے استنباط کردہ احکامات کے مطابق لوگوں پر حکومت کرتے تھے۔ والیوں اور قاضیوں کے اس اجتہاد کے ساتھ ساتھ خلیفہ کچھ خاص شرعی احکامات کی تبنی بھی کیا کرتا تھا اور لوگوں کو ان پر عمل کرنے کا حکم دیتا تھا۔ لوگ اپنی اپنی رائے اور اپنے اجتہاد کو چھوڑ کر ان احکامات پر عمل کرتے تھے۔ کیونکہ یہ ایک شرعی حکم ہے کہ خلیفہ کا حکم ظاہراً اور باطناً نافذ ہوتا ہے۔ اسی بنیاد پر ابو بکر نے یہ تبنی کی کہ ایک ہی وقت تین طلاقیں دینے سے ایک طلاق ہی واقع ہوتی ہے۔ آپ نے یہ تبنی بھی کی کہ مال مسلمانوں میں مساوی طور پر تقسیم کیا جائے گا اور تقسیم کے دوران یہ تفریق نہیں کی جائے گی کہ کوئی شخص پہلے مسلمان ہوا تھا یا بعد میں۔ چنانچہ تمام مسلمانوں نے آپ کا اتباع کیا اور قاضی اور والی بھی آپ کی اس رائے پر چلتے رہے۔ پھر عمر نے اپنے دور میں ان دونوں مسائل میں مختلف رائے اختیار کی، جو ابو بکر کی رائے کے خلاف تھی۔ عمر نے تین دفعہ طلاق دینے کو ایک کی بجائے تین قرار دیا اور مال کو مسلمانوں کے درمیان مساوی طور پر تقسیم

کرنے کی بجائے پہلے اسلام لانے اور کسی فضیلت کے موجود ہونے کو ملحوظ رکھا۔ چنانچہ مسلمانوں نے اس مسئلہ میں عمر ص کی رائے کا اتباع کیا اور قاضی اور والیوں نے بھی اسی رائے کے مطابق عمل کیا۔ پھر آپ نے یہ تبنی بھی کی کہ جو زمین جنگ میں مالِ غنیمت کے طور پر حاصل ہو جائے، اسے اس کے مالکوں کے پاس ہی رہنے دی جائے۔ اسے لڑنے والوں یا مسلمانوں کے درمیان تقسیم نہ کیا جائے۔ لہٰذا قاضی اور والی اس رائے میں آپ کی پیروی کرتے رہے اور اس تبنی کے مطابق فیصلے کرتے رہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ صحابہ کرامؓ کا اس پر اجماع تھا کہ خلیفہ کچھ متعین احکامات کی تبنی کر سکتا ہے اور ان پر عمل کرنے کا حکم بھی دے سکتا ہے۔ اور مسلمانوں پر اس کی اطاعت فرض ہے، اگرچہ یہ ان کے اپنے اجتہاد کے خلاف ہو۔ چنانچہ یہ مشہور شرعی قواعد ہیں:

لِلسُّلْطَانِ اَنْ يُّحْدِثَ مِنَ الْاَقْضِيَةِ بِقَدْرِ مَايَحْدُثُ مِنْ مُشْكِلَات

''سلطان نئے مسائل کے لیے بقدرِ ضرورت نیا حل تلاش کرتا ہے''

اَمْرُ الْاِمَامِ يَرْفَعُ الْخِلَاف

''امام کا حکم اختلاف کو دُور کرتا ہے''

اَمْرُالْاِمَامِ نَافِذٌاً ظَاہِرًا وَبَاطِنًا

''امام کا حکم ظاہری اور باطنی طور پر نافذ ہوتا ہے''

یہی وجہ ہے کہ اس کے بعد بھی خلفاء مخصوص احکامات کی تبنی کرتے رہے۔ چنانچہ ہارون الرشید نے اقتصادی معاملات میں کتابُ الخَراج کی تبنی کی، اور اس کتاب میں موجود تمام احکامات پر عمل کرنے کو لوگوں پر لازمی قرار دیا۔

دستوراور قانون

لفظ 'قانون' ایک اجنبی اصطلاح ہے اوراُن لوگوں کے نزدیک اس کا معنی ہے: وہ حکم جسے حکمران صادر کرتے ہیں تاکہ لوگ اس پر چلیں۔ قانون کی تعریف یوں کی گئی ہے کہ: ''انسانوں کے تعلقات کے بارے میں قواعد کاوہ مجموعہ، جن کی پیروی کرنے پر حکمران لوگوں کو مجبور کردے۔'' کسی بھی حکومت کے اساسی قانون کے لیے 'دستور' کالفظ استعمال کیا جاتاہے۔ دستور کی بنیاد پر وجود میں آنے والے نظام سے نکلنے والے قانون (احکامات) پر بھی لفظ قانون کااطلاق ہوتاہے۔ دستور کی تعریف یوں کی گئی ہے: ''وہ قانون، جو ریاست اور ریاست کے نظامِ حکمرانی کی شکل وصورت متعین کرے،اور اس میں موجود ہر اتھارٹی کی حدوداور ذمہ داریوں کوواضح کرے۔'' یا ''دستور وہ قانون ہے جو عوامی اتھارٹی یعنی حکومت کو منظم کرتاہے اور حکومت کے ساتھ افراد کے تعلقات کی حدود متعین کرتا ہے،افراد پر حکومت کے حقوق اورذمہ داری اوراسی طرح حکومت پر افراد کے حقوق اور ذمہ داری کی وضاحت (نشاندہی) کرتاہے'' دستور مختلف طریقوں سے وجود میں آئے۔ کچھ دستور قوانین کی شکل میں مرتب کیے گئے اور بعض دساتیر نے عادات اور رسوم ورواج سے جنم لیا، جیساکہ برطانیہ کادستور ہے۔ اس طرح بعض دستور ایسے ہوتے ہیں، جنہیں قومی اسمبلی کی وہ کمیٹی وضع کرتی ہے، جسے اس وقت یہ اتھارٹی حاصل ہوتی ہے۔ وہی دستور وضع کرتی ہے اور وہی اس دستور میں تبدیلی کے طریقۂ کار کاتعین کرتی ہے۔ پھر یہ کمیٹی ختم ہوجاتی ہے اوراس کی جگہ وہ اتھارٹی لے لیتی ہیں جو اس دستور کی بدولت وجود میں آتی ہے، جیساکہ فرانس اورامریکہ میں ہوا۔ دستوراور قانون کو جن مصادر سے اخذ کیاجاتاہے،ان کی دواقسام ہیں۔ پہلا مصدر وہ منبع ہے، جس سے دستوراور قانون براہِ راست پھوٹتے ہیں، جیسے معاشرتی عادات، مذہب، قانونی ماہرین کی آراء، عدالتوں کے فیصلے، عدل و مساوات کے اصول وغیرہ۔ اسے قانونی مصدر (Legislative Source) کہاجاتاہے۔اس کی مثال مغربی ممالک، برطانیہ، امریکہ وغیرہ کادستور ہے۔

دوسرا مصدر تاریخی مصدر رہے، جس سے دستور یا قانون کو اخذ یا نقل کیا جاتا ہے جیسا کہ فرانس کے دستور سے، بعض اسلامی ممالک جیسے ترکی، مصر، عراق، شام کا دستور اس کی مثال ہیں۔

یہ لفظ 'دستور' اور لفظ 'قانون' کی اصطلاح کا خُلاصہ ہے۔ یعنی ریاست متعدد مصادر سے، خواہ وہ قانونی مصدر ہو یا تاریخی، کچھ متعین احکامات کو اختیار (تبنّی) کرتی ہے اور ان پر عمل کرنے کا حکم دیتی ہے۔ ریاست کی جانب سے تبنی کرنے کے بعد یہ احکامات دستور بن جاتے ہیں۔ پھر اگر یہ عمومی احکامات ہوں تو انہیں دستور کہا جاتا ہے، اور اگر یہ مخصوص احکامات ہوں، تو انہیں قانون کا نام دے دیا جاتا ہے۔

آج مسلمانوں کو جس سوال کا جواب دینا ہے، وہ یہ ہے کہ آیا ان اصطلاحات کا استعمال جائز ہے یا نہیں؟ اس کا جواب یہ ہے کہ وہ اجنبی الفاظ، جن کے اصطلاحی معانی ہوں اور یہ اصطلاح مسلمانوں کی اصطلاح کے مخالف ہو، تو اس کا استعمال جائز نہیں۔ مثلاً اجتماعی عدل کی اصطلاح، کیونکہ اس سے مراد ایک مخصوص نظام ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ غریبوں کو تعلیمی اور طبّی سہولیات کی ضمانت دی جائے اور ملازموں اور مزدوروں کے حقوق کی حفاظت کی ضمانت دی جائے۔ یہ اصطلاح مسلمانوں کی اصطلاح کے خلاف ہے۔ کیونکہ مسلمانوں کے نزدیک عدل ظلم کی ضد ہے اور تعلیمی وطبّی سہولیات کی ضمانت تمام انسانوں کے لیے ہے، خواہ وہ غریب ہوں یا امیر۔ اسی طرح محتاج اور ضعیف افراد کے حقوق کی ضمانت ان سب کے لیے ہے، جو اسلامی ریاست کے زیر سایہ رہتے ہوں، خواہ وہ ملازم ہوں یا نہ ہوں، اور خواہ وہ مزدور ہوں یا کسان، یا کچھ اور۔ اس کے برعکس اگر وہ لفظ ایسی اصطلاح کے طور پر ہو، جس کا معنی اور مفہوم مسلمانوں کے ہاں موجود ہو، تو اس کا استعمال جائز ہے، مثلاً لفظ ''ضریبۃ'' (ٹیکس)۔ کیونکہ اس سے مراد وہ مال ہے، جو ریاست کا انتظام چلانے کے لیے لوگوں سے لیا جاتا ہے اور ریاست کا انتظام چلانے کے لیے لوگوں سے مال لینے کا طریقہ مسلمانوں کے ہاں بھی پایا جاتا ہے۔ اس لیے لفظ 'ٹیکس' کا استعمال جائز ہے۔ اسی طرح لفظ 'قانون' اور 'دستور' کا معنی ہے کہ ریاست کچھ مخصوص متعین احکامات اختیار کرتی ہے، لوگوں کے لیے اس کا اعلان کرتی، اس پر عمل کرنے

کو لازمی قرار دیتی ہے اور انہی احکامات کے مطابق لوگوں پر حکومت کرتی ہے۔ یہ مفہوم مسلمانوں کے ہاں بھی پایا جاتا ہے۔ چنانچہ لفظ 'قانون' اور 'دستور' کے استعمال میں کوئی امر مانع نہیں ہے۔ چنانچہ دستور اور قانون سے مراد وہ احکامات ہیں، جنہیں خلیفہ احکامِ شرعیہ میں سے تبنی کرے۔ البتہ اسلامی دستور و قوانین اور غیر اسلامی دستور و قوانین کے درمیان بڑا فرق ہے۔ کیونکہ غیر اسلامی قوانین اور دستور کا مصدر عادات اور عدالتوں کے فیصلے وغیرہ ہوتے ہیں۔ ان کی تاسیس وہ تاسیسی کمیٹی کرتی ہے جو دستور وضع کرتی ہے اور عوام کی منتخب کردہ اسمبلی قوانین وضع کرتی ہے۔ کیونکہ ان کے نزدیک عوام ہی طاقت و قوت کا سرچشمہ ہیں اور اقتدارِ اعلیٰ عوام کو حاصل ہے۔ جبکہ اسلامی دستور اور اسلامی قوانین کا مصدر صرف کتاب اللہ اور سنت رسول اہے، اور ان کی تاسیس مجتہدین کے اجتہادات سے ہوتی ہے۔ جن میں سے خلیفہ متعین احکامات کی تبنی کرتا ہے اور ان کے ذریعے حکومت کرتا ہے، اور لوگوں کے لیے ان احکامات کی پابندی کرنا لازم ہوتا ہے۔ کیونکہ بالادستی شریعت کو حاصل ہے اور شرعی احکامات کے استنباط کے لیے اجتہاد کرنا تمام مسلمانوں کا حق ہے۔ اجتہاد کرنا فرضِ کفایہ ہے، اور احکامات کو اختیار کرنے (تبنی کرنے) کا حق صرف خلیفہ کو حاصل ہے۔

یہ بحث قانون اور دستور کے الفاظ کے استعمال کے جائز ہونے کے حوالے سے تھی۔ جہاں تک احکامات کی تبنی کی ضرورت کے ثبوت کی بات ہے، تو مسلمان ابو بکر ص کے عہد سے لے کر آخری مسلمان خلیفہ کے عہد تک، مخصوص احکامات کی تبنی کرنے اور ان احکامات پر عمل کا حکم دینے کے اصول پر قائم رہے۔ البتہ یہ تبنی مخصوص احکامات کی ہوتی تھی، اور یہ ان تمام عام احکامات کی تبنی نہیں ہوا کرتی تھی، کہ جن کے مطابق ریاست حکومت چلاتی تھی۔ ریاست نے بعض ادوار کے علاوہ کبھی عام احکامات کی تبنی نہیں کی۔ عام احکامات کی تبنی کی مثال یہ ہے کہ ایوبیوں نے شافعی مذہب کی تبنی کی اور عثمانی خلافت نے ابو حنیفہ کے مذہب کی تبنی کی۔

اب یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ایک ہمہ گیر دستور اور عام قوانین کو اختیار کرنا مسلمانوں کے مفاد میں ہے یا ان کے مفاد کے خلاف ہے ؟اس کا جواب یہ ہے کہ ایک ہمہ گیر دستور اور تمام احکامات کے بارے میں عام قوانین بنانا جِدّت پسندی اور اجتہاد کے لیے مدد ومعاون نہیں ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ قرونِ اُولیٰ یعنی صحابہؓ، تابعین اور تبع تابعین کے عہد میں مسلمان اس بات سے اجتناب کرتے رہے کہ خلیفہ تمام احکامات کی تبنی کرے۔ بلکہ وہ صرف اُن مخصوص احکامات کی تبنی پر اکتفاء کرتے رہے، جو وحدتِ حکم (حکومت کے ایک ہونے) وحدتِ تشریع (قانون کے ایک ہونے) وحدتِ ادارہ (انتظامی امور کے ایک ہونے) کے لیے ناگزیر ہو۔ اس بناء پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ جدت پسندی اور اجتہاد کے فروغ کے لیے بہتر یہ ہے کہ ریاست کے لیے کوئی ایسا ہمہ گیر دستور نہ ہو، جو تمام احکامات پر مشتمل ہو۔ بلکہ ریاست کا دستور ان عام احکامات پر مشتمل ہو، جو ریاست کی شکل وصورت کا تعین کرے اور اس کی وحدت کی بقاء کی ضمانت دے۔ اجتہاد واستنباط کو والیوں اور قاضیوں پر چھوڑ دیا جائے۔ تاہم یہ اس صورت میں ہوگا کہ جب اجتہاد عام ہو اور لوگ اجتہاد کر سکتے ہوں۔ جیسا کہ صحابہؓ، تابعین اور تبع تابعین کے عہد میں تھا۔ اگر تمام لوگ مقلد ہوں اور مجتہد شاذ ونادر ہی پائے جاتے ہوں تو اس صورت میں ریاست کے لیے ضروری ہے کہ وہ ایسے احکامات کی تبنی کرے کہ جن کے مطابق خلیفہ، والی اور قاضی وغیرہ لوگوں پر حکومت کر سکیں۔ کیونکہ اس کے بغیر اللہ تعالیٰ کے نازل کردہ احکامات کے مطابق حکومت کرنا مشکل ہو جائے گا اور والی اور قاضی مختلف اور متضاد تقلید کا شکار ہو جائیں گے۔ تبنی تدریس یعنی واقعہ کو سمجھنے اور دلیل کی معرفت حاصل کرنے کے بعد ہوتی ہے۔ علاوہ ازیں اگر والیوں اور قاضیوں کو اپنے علم کے مطابق حکومت کرنے کی اجازت دے دی جائے، تو ایک ہی ریاست بلکہ ایک ہی ولایہ میں احکامات مختلف ہوں گے۔ بلکہ ہو سکتا ہے کہ حکومت اللہ کے نازل کردہ احکامات کے مطابق ہی نہ ہو۔ اس لیے اسلامی ریاست پر لازم ہے کہ وہ آج مسلمانوں کی اسلام سے عدم آگاہی کا ادراک کرتے ہوئے مخصوص احکامات کی تبنی کرے۔ یہ تبنی معاملات اور عقوبات کے بارے میں ہونی چاہیے، نہ کہ عقائد وعبادات کے بارے میں۔ اور یہ تبنی تمام احکامات کے لیے عمومی نوعیت کی ہونی چاہیے۔ تاکہ ریاست کے معاملات منظم ہو سکیں اور مسلمانوں کے تمام امور شرعی احکامات کے مطابق

سرانجام پائیں۔ اس لیے ریاست جب بھی احکام کی تبنی کرے اور دستور و قوانین وضع کرے، تو صرف اور صرف شرعی احکامات کا اتباع کرے۔ اس کے علاوہ کسی اور چیز کو اخذ نہ کرے، بلکہ کسی اور چیز کی تدریس بھی نہ کرے۔ لہٰذا احکامِ شرعیہ کے علاوہ کسی اور چیز کو اختیار نہیں کیا جائے گا، اس سے قطع نظر کہ وہ چیز اسلام کے مخالف ہے یا اسلام سے موافقت رکھتی ہے۔ مثلاً ریاست اشیاء کو حکومتی تحویل میں لے لینے (نیشنلائزیشن) کی پالیسی کو اختیار نہیں کر سکتی، بلکہ وہ عوامی ملکیت کے احکامات کو ہی اختیار کرے گی۔ اس لیے ہر وہ چیز جس کا تعلق فکر اور طریقہ سے ہے اس میں وہ لازمی طور پر شرعی احکامات ہی کی پیروی کرے گی۔ البتہ وہ قوانین اور نظام، جو فکر اور طریقہ سے تعلق نہیں رکھتے، پس ان سے زندگی کے متعلق کسی خاص نقطۂ نظر کا اظہار نہیں ہوتا، مثلاً انتظامی قوانین یا اداروں کی ترتیب اور ڈھانچے یا اس قسم کی دوسری چیزیں، تو یہ اسلوب و وسائل میں شمار ہوتے ہیں۔ یہ سائنس، صنعت اور فنون کی مانند ہیں۔ ریاست انہیں اختیار کر کے لوگوں کے امور کی دیکھ بھال کی تنظیم کر سکتی ہے۔ جیسا کہ عمر بن خطاب ص نے کیا کہ جب آپ نے دفاتر کو ترتیب دینا چاہا تو آپ نے اس ترتیب کو اہل فارس سے اخذ کیا۔ یہ انتظامی اور فنی اشیاء نہ تو دستور سے ہیں اور نہ ہی شرعی قوانین میں سے۔ پس یہ دستور میں داخل نہیں۔ اس لیے یہ اسلامی ریاست کی ذمہ داری ہے کہ اس کا دستور احکامِ شرعیہ پر مبنی ہو، اور یعنی اس کا دستور بھی اسلامی ہو اور اس کا قانون بھی اسلامی ہو۔ جب ریاست کسی حکم کی تبنی کرے، تو وہ اس کی تبنی شرعی دلیل کی مضبوطی کی بناء پر کرے، اور اس کے ساتھ ساتھ وہ درپیش مشکل کی حقیقت کو بھی صحیح طور پر سمجھے۔ چنانچہ ریاست پر لازم ہے کہ وہ پہلے مسئلہ کو اچھی طرح سمجھنے کے لیے مسئلے کی تحقیق کرے کیونکہ سب سے ضروری چیز مسئلہ کو سمجھنا ہے۔ پھر اس مسئلہ کا شرعی حکم معلوم کرے۔ پھر اس شرعی حکم کی دلیل کی تدریس کرے اور پھر دلیل کی مضبوطی کی بنیاد پر اس حکم کی تبنی کرے۔ یہ شرعی احکامات یا تو مجتہدین میں سے کسی مجتہد کی رائے میں سے اختیار کیے جائیں۔ جس کی دلیل معلوم ہو اور اس دلیل کی قوت پر اطمینان بھی ہو۔ یا پھر یہ شرعی احکامات کتاب اللہ، سنت رسول ا اجماعِ صحابہؓ اور قیاس سے شرعی اجتہاد کے ذریعے اخذ کر کے اختیار کیے جائیں۔ خواہ یہ اجتہاد جزئی ہو، یعنی یہ ایک ہی مسئلے پر اجتہاد ہو۔ چنانچہ ریاست جب مال کے بیمہ کی ممانعت کی تبنی کا ارادہ کرے، تو

ضروری ہے کہ وہ پہلے اس امر کی تحقیق کرے کہ ساز وسامان کا بیمہ کیا ہوتا ہے؟ ریاست اس امر کو سمجھے، پھر ملکیت کے حصول کے ذرائع کی تدریس کرے، پھر ملکیت سے متعلق اللہ تعالیٰ کے حکم کا بیمہ کے مسئلہ پر انطباق کرے اور پھر اس کے متعلق شرعی حکم کی تبنی کرے۔ یہی وجہ ہے کہ دستور اور ہر قانون کے لیے ایک ابتدائیہ کا ہونا ضروری ہے جو اس مذہب کی وضاحت کرے جس سے وہ قانونی دفعہ لی گئی ہو اور اس دلیل کی وضاحت کرے جس پر اعتماد کیا گیا ہو یا اس دلیل کی وضاحت کرے جس سے اس قانونی دفعہ کا درست اجتہاد کے ذریعے استنباط کیا گیا ہو، تاکہ مسلمانوں کو یہ معلوم ہو سکے کہ ریاست دستور اور قوانین سے متعلق جن احکامات کی تبنی کرتی ہے، وہ احکامِ شرعیہ ہیں اور انہیں صحیح اجتہاد کے ذریعے مستنبط کیا گیا ہے۔ کیونکہ مسلمانوں پر ریاست کے احکامات کی اطاعت صرف اس صورت میں فرض ہے کہ جب ریاست کے تبنی کردہ احکامات، احکامِ شرعیہ پر مبنی ہوں۔ اسی بنیاد پر ریاست دستور اور قوانین کے لیے احکامِ شرعیہ کی تبنی کرتی ہے، تاکہ وہ اِن احکامات کے ذریعے اُن لوگوں پر حکمرانی کرے، جو اس کے زیرِ سایہ رہتے ہیں۔

بطورِ مثال ہم مسلمانوں کے سامنے عالمِ اسلام کے لیے اسلامی ریاست کے دستور کا مجوزہ خاکہ رکھتے ہیں، تاکہ وہ اسے پڑھیں اور اُس اسلامی ریاست کے قیام کے لیے عملی کوشش کریں، جو دنیا کے سامنے اسلامی دعوت کو پیش کرے گی۔ یہاں یہ بات پیشِ نظر رہے کہ یہ مجوزہ دستور کسی خاص ملک کے لیے نہیں یا اس کا مقصود کوئی خاص علاقہ یا خاص خطہ نہیں، بلکہ یہ دستور اسلامی دنیا کی اسلامی ریاست کے لیے ہے۔

مسودۂ دستور

عمومی احکامات

دفعہ نمبر1: اسلامی عقیدہ ہی ریاست کی بنیاد ہے، یعنی ریاست کی ساخت، اس کے ڈھانچے، اس کا محاسبہ یا کوئی بھی ایسی چیز جو ریاست سے متعلق ہو، وہ اسلامی عقیدے ہی کی بنیاد پر استوار ہو گی۔ دستور اور شرعی قوانین کی بنیاد بھی یہی عقیدہ ہے۔ دستور اور قوانین سے متعلق صرف اس چیز کو قبول کیا جائے گا، جو اسلامی عقیدے سے اخذ کردہ ہو۔

دفعہ نمبر2: دار الاسلام وہ ملک ہے جہاں اسلامی احکامات نافذ ہوں اور اس کا امن و تحفظ اسلامی قوت کے بل بوتے پر ہو۔ دار الکفر وہ ہے جہاں کفریہ نظام نافذ ہو یا اس کا امن و تحفظ اسلام کے علاوہ کسی اور قوت کے مرہونِ منت ہو۔

دفعہ نمبر3: خلیفہ متعین شرعی احکامات کی تبنی کرے گا جو دستور اور قوانین ہونگے۔ خلیفہ جب کسی حکمِ شرعی کی تبنی کرے تو صرف یہی حکم وہ حکمِ شرعی ہو گا جس پر عمل کرنا عوام پر فرض ہو گا۔ یہ اس وقت سے ہی نافذ العمل قانون بن جائے گا جس پر عمل درآمد عوام میں سے ہر فرد پر ظاہراً اور باطناً فرض ہو گا۔

دفعہ نمبر4: خلیفہ عبادات میں سے زکوٰۃ و جہاد کے سوا کسی متعین حکمِ شرعی کی تبنی نہیں کرے گا۔ نہ وہ اسلامی عقیدہ سے متعلقہ افکار میں سے کسی فکر کی تبنی کرے گا۔

دفعہ نمبر5: وہ تمام افراد، جو اسلامی ریاست کی شہریت کے حامل ہوں، انہیں تمام شرعی حقوق حاصل ہونگے اور انہیں اپنے شرعی فرائض پورا کرنے ہوں گے۔

دفعہ نمبر6: ریاست کے لیے بالکل جائز نہیں کہ وہ اپنے شہریوں کے مابین حکومتی معاملات، عدالتی فیصلوں، لوگوں کے امور کی دیکھ بھال اور دیگر مسائل میں کسی قسم کا امتیازی سلوک برتے۔ بلکہ ریاست کی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنے تمام افراد کو رنگ، نسل اور دین سے قطع نظر ایک ہی نظر سے دیکھے۔

دفعہ نمبر7: ریاست ان تمام افراد پر، جو اسلامی ریاست کے شہری ہوں، خواہ وہ مسلم ہوں یا غیر مسلم، حسبِ ذیل طریقے سے اسلامی شریعت نافذ کرے گی:

(ا) مسلمانوں پر بغیر کسی استثناء کے تمام اسلامی احکامات نافذ کرے گی۔

(ب) غیر مسلم جو بھی اعتقاد رکھیں اور جس طرح چاہیں عبادت کریں، ان سے اُس کے متعلق بازپرس نہیں کی جائے گی۔

(ج) ریاست مرتدین پر مرتد سے متعلق اسلامی احکامات لاگو کرے گی، بشرطیکہ وہ خود مرتد ہوئے ہوں۔ لیکن اگر وہ مرتدین کی اولاد ہوں اور پیدائشی غیر مسلم ہوں تو ان کے ساتھ غیر مسلموں کا سا معاملہ کیا جائے گا۔ یعنی صورت حال کے مطابق کہ وہ مشرک ہیں یا اہل کتاب۔

(د) غیر مسلموں کے ساتھ کھانے پینے اور لباس کے معاملات میں شرعی احکامات کی حدود میں رہتے ہوئے ان کے دین کے مطابق معاملہ کیا جائے گا۔

(ہ) غیر مسلموں کے درمیان شادی و طلاق کے معاملات ان کے ادیان کے مطابق نمٹائے جائیں گے اور مسلمانوں کے ساتھ غیر مسلموں کے یہ معاملات اسلامی احکامات کے مطابق طے کیے جائیں گے۔

(و) باقی تمام شرعی احکامات اور شرعی امور مثلاً معاملات، عقوبات، بینات (گواہوں)، نظامِ حکومت اور اقتصادیات وغیرہ کو تمام رعایا پر، خواہ وہ مسلم ہوں یا غیر مسلم، ریاست برابری کی بنیاد پر نافذ کرے گی۔ اسی طرح معاہدین (اہلِ معاہدہ)، مستامنین (اسلامی ریاست کی امان میں آنے والے) اور ہر اس شخص پر جو اسلامی ریاست کے زیر سایہ رہتا ہے، ریاست ان احکامات کو نافذ کرے گی، ماسوائے سفیر، ایلچی اور اسی نوعیت کے دیگر لوگ جنہیں سفارتی امان حاصل ہو گی۔

دفعہ نمبر8: عربی زبان ہی چونکہ اسلام کی زبان ہے، اس لیے ریاست صرف عربی زبان استعمال کرے گی۔

دفعہ نمبر9: اجتہاد فرضِ کفایہ ہے، ہر مسلمان کو اجتہاد کا حق حاصل ہے، بشرطیکہ اس کے اندر اجتہاد کے لیے درکار شرائط پائی جاتی ہوں۔

دفعہ نمبر10: اسلام کے بارے میں تمام مسلمان جوابدہ ہیں، اس لیے اسلام میں رجالِ دین کا طبقہ نہیں ہوتا۔ چنانچہ ریاست کا فرض ہے کہ جب وہ مسلمانوں کے اندر اس قسم کے رجحانات محسوس کرے تو انہیں روک دے۔

دفعہ نمبر11: ریاست کا اصل کام اسلامی دعوت کا علمبردار بننا ہے۔

دفعہ نمبر12: کتاب اللہ، سنتِ رسول ا، اجماعِ صحابہؓ اور قیاس ہی شرعی احکامات کے لیے معتبر ادِلّہ ہیں۔

دفعہ نمبر13: (عدالتی معاملات میں) اصل بری الذمہ ہونا ہے۔ عدالتی حکم کے بغیر کسی (شخص) کو سزا نہیں دی جائے گی۔ کسی پر تشدد کرنا بالکل جائز نہیں اور جو اس کا مرتکب ہوگا، اسے سزا دی جائے گی۔

دفعہ نمبر14: افعال کی اصل شرعی احکامات پر عمل کرنا ہے، لہٰذا شرعی حکم معلوم کیے بغیر کوئی کام نہیں کیا جائے گا۔ اسی طرح اشیاء میں اصل اباحت (جائز ہونا) ہے، یہاں تک کہ کسی چیز کے حرام ہونے کی کوئی دلیل موجود نہ ہو۔

دفعہ نمبر15: حرام کا وسیلہ (ذریعہ) بھی حرام ہے جب غالب گمان ہو کہ یہ ذریعہ حرام تک لے جائے گا۔ اگر صرف خدشہ ہو کہ یہ ذریعہ حرام تک لے جائے گا تو وہ امر حرام نہیں ہوگا۔

نظامِ حکومت

دفعہ نمبر16: حکومت کا نظام وحدت کا ہوگا اور یہ اتحادی نوعیت کا نہیں ہوگا۔

دفعہ نمبر17: حکومت مرکزی ہوگی اور انتظامی امور لامرکزیت کی بنیاد پر ہونگے۔

دفعہ نمبر18: حکام چار ہیں: خلیفہ، معاونِ تفویض، والی اور عامل۔ ان کے علاوہ باقی سب ملازم ہیں، حکام نہیں۔

دفعہ نمبر19: حکومت یا حکومت سے متعلقہ امور (جنہیں حکومت میں شمار کیا جاتا ہو) چلانے والا شخص صرف آزاد، بالغ، عاقل، عادل، مرد، اور مسلمان ہی ہو سکتا ہے، اور یہ کہ وہ اس کام کو کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو۔

دفعہ نمبر20: حکام کا محاسبہ مسلمانوں کا حق بھی ہے اور یہ مسلمانوں پر فرضِ کفایہ بھی ہے۔ رعایا کے غیر مسلم افراد کو حکمران کے ظلم یا اسلامی احکامات کو غلط انداز سے نافذ کرنے کی شکایت کے اظہار کا حق حاصل ہے۔

دفعہ نمبر21: حکام کے محاسبہ یا امت کے ذریعے حکومت تک پہنچنے کے لیے مسلمانوں کو سیاسی پارٹیاں بنانے کی اجازت ہے، بشرطیکہ یہ پارٹیاں اسلامی عقیدہ کی بنیاد پر ہوں اور جن احکامات کی ان پارٹیوں نے تبنی کی ہو، وہ شرعی احکامات ہوں۔ پارٹی بنانے کے لیے کسی سے اجازت لینے کی ضرورت نہیں ہو گی۔ غیر اسلامی بنیاد پر ہر قسم کی پارٹی سازی ممنوع ہو گی۔

دفعہ نمبر22: حکمرانی کے یہ چار بنیادی اصول ہیں:

(1) اقتدارِ اعلیٰ شریعت کو حاصل ہو گا، نہ کہ عوام کو۔

(2) اتھارٹی (اختیار) امت کو حاصل ہو گی۔

(3) ریاست کے لیے ایک ہی سربراہ (خلیفہ) کا تقرر مسلمانوں پر فرض ہے۔

(4) صرف ریاست کا سربراہ (خلیفہ) ہی شرعی احکامات کی تبنی کرے گا اور وہی دستور اور تمام قوانین مرتب کرے گا۔

دفعہ نمبر23: ریاست تیرہ ڈھانچوں پر مشتمل ہو گی:

(1)خلیفہ

(2)معاونین(وزراء تفویض)

(3)وزراء تنفیذ

(4)والی

(5)امیرِ جہاد

(6)اندرونی سلامتی

(7)خارجی امور

(8)صنعت

(9)عدلیہ

(10)مفادِ عامہ کی دیکھ بھال کا انتظامی ڈھانچہ

(11)بیت المال

(12)میڈیا

(13)مجلسِ امت(شوریٰ اور محاسبہ)

خلیفہ

دفعہ نمبر24: خلیفہ ہی اختیار اور شریعت کے نفاذ میں امت کا نمائندہ ہوتا ہے۔

دفعہ نمبر25: خلافت باہمی رضامندی واختیار کا عقد ہے۔ لہٰذا کسی کو خلافت قبول کرنے یا خلیفہ کے انتخاب پر مجبور نہیں کیا جائے گا۔

دفعہ نمبر26: ہر عاقل و بالغ مسلمان کو، خواہ وہ مرد ہو یا عورت، خلیفہ کے انتخاب میں حصہ لینے اور خلیفہ کی بیعت کرنے کا حق حاصل ہے، لیکن غیر مسلموں کو خلیفہ کے انتخاب یا خلیفہ کی بیعت کا کوئی حق حاصل نہیں۔

دفعہ نمبر27: جن لوگوں کی بیعت سے خلافت کا انعقاد ہوتا ہے اگر وہ لوگ بطورِ خلیفہ کسی ایک شخص کی بیعت کر لیں تو باقی لوگوں کی طرف سے دی جانے والی بیعت، بیعتِ اطاعت ہو گی اور یہ بیعتِ انعقاد نہیں ہو گی۔ چنانچہ جس شخص کے اندر سرکشی کے امکانات نظر آئیں اور وہ مسلمانوں کی وحدت کو توڑنے کی کوشش کرے، تو اسے بیعت پر مجبور کیا جائے گا۔

دفعہ نمبر28: صرف وہی شخص خلیفہ ہو سکتا ہے جسے مسلمان منتخب کریں۔ کسی بھی شخص کو خلیفہ کے اختیارات اس وقت حاصل ہوں گے جب دوسرے شرعی عقود کی طرح اس کی بیعت کا عقد شرعی طور پر مکمل ہو جائے۔

دفعہ نمبر29: وہ ملک یا خطہ، جو خلیفہ کے ہاتھ پر بیعتِ انعقاد کرے، کے لیے شرط ہے کہ اس ملک کا اقتدار اس کا اپنا ہو، جس کا انحصار صرف مسلمانوں پر ہو اور کسی کافر ریاست کا اس اقتدار میں کوئی عمل دخل نہ ہو اور اس ملک کی داخلی و خارجی امان اور مسلمانوں کی امن و سلامتی اسلام کی وجہ سے ہو نہ کہ کفار کے بل بوتے پر۔ جو علاقے صرف خلیفہ کی اطاعت کی بیعت کریں ان کے لیے یہ شرط لازم نہیں۔

دفعہ نمبر30: خلیفہ کے طور پر جس شخص کی بیعت کی جا رہی ہو اس کے اندر انعقادِ خلافت کی تمام شرائط کا موجود ہونا لازم ہے۔ اگرچہ اس کے اندر شروطِ افضلیت نہ بھی ہوں، کیونکہ بنیادی چیز شروطِ انعقاد ہیں۔

دفعہ نمبر31: خلیفہ کے لیے سات شرائط ہیں اور وہ یہ ہیں: وہ مرد ہو، مسلمان ہو، آزاد ہو، بالغ ہو، عاقل ہو، عادل ہو اور وہ خلافت کی ذمہ داری سے عہدہ برآء ہونے کے قابل ہو۔

دفعہ نمبر32: اگر خلیفہ کی موت، اس کے معزول ہونے یا معزول کیے جانے کی وجہ سے منصبِ خلافت خالی ہو جائے تو جس تاریخ کو یہ منصب خالی ہوا اس کے تین دن (بشمول ان کی راتوں) کے اندر اندر دوسرا خلیفہ مقرر کرنا فرض ہے۔

دفعہ نمبر33: (نئے خلیفہ کے تقرر کے سلسلے میں) عبوری امیر کا تقرر کیا جائے گا جو کہ مسلمانوں کے امور کی دیکھ بھال کرے اور منصبِ خلافت کے خالی ہونے کے بعد نئے خلیفہ کے تقرر کے عمل کا آغاز کرے، جو کہ یہ ہو گا:

(ا) سابق خلیفہ جب یہ محسوس کرے کہ اس کی موت کا وقت قریب ہے یا وہ استعفٰے دینا چاہتا ہو، تو اس صورت میں اسے حق حاصل ہے کہ وہ عبوری امیر کا تقرر کرے۔

(ب) اگر عبوری امیر کے تقرر سے قبل خلیفہ کا انتقال ہو جائے یا وہ استعفیٰ دے دے یا خلیفہ کے انتقال یا استعفیٰ کے علاوہ کسی اور وجہ سے منصبِ خلافت خالی ہو جائے تو وہ معاون جو معاونین میں سب سے عمر رسیدہ ہو گا، وہ عبوری امیر ہو گا۔ ماسوائے یہ کہ وہ معاون بذاتِ خود خلافت کا امیدوار ہو۔ ایسی صورت میں وہ معاون عبوری امیر ہو گا جو عمر میں اس سے کم ہو، علیٰ ھذاالقیاس۔

(ج) اگر تمام تر معاون خلافت کے امیدوار ہوں، تو پھر وزراء تنفیذ میں سے سب سے عمر رسیدہ معاون عبوری امیر ہو گا، علیٰ ھذاالقیاس۔

(د) اگر تمام تر وزراء تنفیذ خلافت کے امیدوار ہوں، تو وزراء تنفیذ میں سے سب سے کم عمر وزیر عبوری امیر ہو گا۔

(ھ) عبوری امیر کو احکامات کی تبنی کا اختیار حاصل نہیں ہو گا۔

(و) عبوری امیر اپنی پوری کوشش صرف کرے گا کہ وہ خلیفہ کے تقرر کے عمل کو تین دن کے اندر اندر مکمل کرے۔ اس مدت میں توسیع کی اجازت نہیں، ماسوائے یہ کہ محکمہ المظالم کسی شدید سبب کی بناپر اس مدت میں توسیع کردے۔

دفعہ نمبر34: خلیفہ کے تقرر کا طریقہ بیعت ہے۔ خلیفہ کی تقرری اور اسے بیعت دینے کا عملی طریقہ یہ ہے:

(ا) محکمۃ المظالم منصبِ خلافت کے خالی ہونے کا اعلان کرے گا۔

(ب) عبوری امیر اپنی ذمہ داری سنبھالے گا اور فوری طور پر نامزدگیوں کے کھلنے کا اعلان کرے گا۔

(ج) وہ نامزدگیاں قبول کی جائیں گی جو انعقادِ خلافت کی شرائط پر پوری اترتی ہوں۔ اس کے علاوہ پیش کی جانے والی نامزدگیاں محکمۃ المظالم کے فیصلے کی بناپر مسترد کردی جائیں گی۔

(د) وہ امیدوار جن کی درخواستوں کو محکمۃ المظالم نے قبول کیا، مجلسِ امت کے مسلمان رکن ان امیدواروں کی فہرست کو دو مرتبہ مختصر کریں گے۔ پہلے اختصار میں وہ اکثریتی ووٹ کی بنیاد پر چھ لوگوں کا انتخاب کریں گے۔ دوسرے اختصار میں وہ اکثریتی ووٹ کی بنیاد پر دو امیدواروں کا انتخاب کریں گے۔

(ھ) ان دو امیدواروں کے نام کا اعلان کیا جائے گا اور مسلمانوں کو ان دونوں میں سے ایک کا انتخاب کرنا ہو گا۔

(و) اس انتخاب کے نتیجے کا اعلان کیا جائے گا اور لوگوں کو آگاہ کیا جائے گا کہ دونوں میں سے کسے زیادہ لوگوں کے ووٹ حاصل ہوئے۔

(ز) وہ شخص جسے زیادہ ووٹ حاصل ہوئے، مسلمان اسے قرآن وسنت پر عمل پر بیعت دیں گے۔

(ح) بیعت کے مکمل ہونے کے بعد عوام الناس کے لیے اس بات کا اعلان کیا جائے گا کہ کون مسلمانوں کا خلیفہ ہے یہاں تک کہ یہ خبر پوری امتِ مسلمہ تک پہنچ جائے۔ اور اس خبر میں خلیفہ کے نام کا اور ان شرائط کا اعلان کیا جائے گا جنہوں نے اُسے اس بات کا اہل بنایا کہ اس کی خلافت کا انعقاد کیا گیا۔

(ط) نئے خلیفہ کی تنصیب کے عمل کے مکمل ہونے کے بعد عبوری امیر کی اتھارٹی اختتام کو پہنچے گی۔

دفعہ نمبر35: خلیفہ کے تقرر کا اختیار امت کو ہی حاصل ہے۔ لیکن جب شرعی طریقے سے خلیفہ کا انتخاب ہو جائے تو پھر امت اسے معزول نہیں کر سکتی۔

دفعہ نمبر36: خلیفہ کے پاس درج ذیل اختیارات ہوتے ہیں:

(ا) خلیفہ ہی ان احکامات کی تبنی (یعنی احکامات کو اختیار) کرتا ہے، جو لوگوں کے امور کی دیکھ بھال کے لیے ضروری ہوں، اور یہ تبنی کتاب و سنت سے صحیح اجتہاد کے ذریعے مستنبط کردہ احکامات کی ہوتی ہے۔ تاکہ یہ احکامات قوانین بن جائیں۔ ان قوانین پر عمل فرض ہوتا ہے۔ ان کی مخالفت جائز نہیں۔

(ب) خلیفہ ہی ریاست کی خارجی و داخلی پالیسی کے بارے میں جوابدہ ہوتا ہے۔ وہی فوج کا سربراہ ہوتا ہے۔ وہی اعلانِ جنگ، صلح یا جنگ بندی کا اعلان کر سکتا ہے اور تمام معاہدات کا اختیار اسی کو حاصل ہوتا ہے۔

(ج) خلیفہ ہی بیرونی سفیروں کو قبول یا مسترد کر سکتا ہے۔ اسی طرح وہ مسلمان سفیروں کو مقرر یا معزول کر سکتا ہے۔

(د) خلیفہ ہی معاونین اور والیوں کا تقرر یا انہیں سبکدوش کر سکتا ہے، جس طرح وہ مجلسِ امت کے سامنے جوابدہ ہوتے ہیں، اُسی طرح خلیفہ کے سامنے بھی جوابدہ ہوتے ہیں۔

(ہ) خلیفہ ہی قاضی القضاۃ اور دیگر قاضیوں کو مقرر اور معزول کر سکتا ہے، تاہم ایک صورت میں خلیفہ قاضی مظالم کو معزول نہیں کر سکتا، وہ یہ ہے کہ جب وہ خلیفہ یا معاون یا قاضی القضاۃ کے خلاف کیس کا جائزہ لے رہا ہو۔ اسی طرح خلیفہ ہی مختلف شعبوں کے ڈائریکٹروں، فوج کے کمانڈروں اور صوبوں کے والیوں کو مقرر یا معزول کر سکتا ہے۔ یہ سب خلیفہ کے سامنے جوابدہ ہوتے ہیں۔ اور یہ مجلسِ امت کے سامنے جوابدہ نہیں ہوتے۔

(و) خلیفہ ہی ریاست کے بجٹ سے متعلق احکامِ شریعت کی تبنی کا اختیار رکھتا ہے اور وہی بجٹ کی مدات اور آمدن و خرچ سے متعلقہ رقموں کا تعین بھی کرتا ہے۔

دفعہ نمبر37: خلیفہ قوانین کی تبنی میں احکامِ شریعت کا پابند ہے، چنانچہ کسی ایسے حکم کی تبنی کرنا اس کے لیے حرام ہے جس کا اس نے ''ادِلّہ شرعیہ'' سے صحیح طور پر استنباط نہ کیا ہو۔ وہ اپنے تبنی کردہ احکامات اور طریقہ استنباط کا بھی پابند ہے۔ چنانچہ اس کے لیے جائز نہیں کہ وہ کسی ایسے حکم کی تبنی کرے جس کے استنباط کا طریقہ اُس طریقے سے متناقض ہو جسے خلیفہ تبنی کر چکا ہے، اور نہ ہی اس کے لیے جائز ہے کہ وہ کوئی ایسا حکم دے جو اس کے تبنی کردہ احکامات سے متناقض ہو۔

دفعہ نمبر38: خلیفہ کو اپنی صوابدید اور اجتہاد کے مطابق لوگوں کے امور کی دیکھ بھال کرنے کا مکمل حق حاصل ہے اور اسے ان مباحات کی تبنی کرنے کا حق بھی حاصل ہے جو ریاست کے معاملات کو چلانے اور لوگوں کے امور کی دیکھ بھال کو آسان بنانے کے لیے درکار ہوں۔ تاہم اس کے لیے یہ جائز نہیں کہ وہ مصلحت کو دلیل بنا کر کسی حکمِ شرعی کی مخالفت کرے۔ مثلاً اس کے لیے جائز نہیں کہ وہ غذائی قلت کو دلیل بنا کر لوگوں کو کثرتِ اولاد سے منع کرے یا وہ استحصال کو روکنے کے نام پر، یعنی اس کو دلیل بنا کر لوگوں کے لیے اشیائے صرف کی قیمتیں مقرر کرے یا وہ لوگوں کے امور کی دیکھ

بھال یا مصلحت کو دلیل بنا کر کسی کافر یا کسی عورت کو والی مقرر کرے۔ اس کے علاوہ کسی بھی حالت میں اسے احکامِ شرع کی مخالفت کرنے کی اجازت نہیں ہے۔ کسی حلال کو حرام یا کسی حرام کو حلال قرار دینا اس کے لیے جائز نہیں۔

دفعہ نمبر39: خلیفہ کے لیے کوئی محدود مدت مقرر نہیں ہے۔ جب تک وہ شرع کی حفاظت، شرعی احکامات کی تنفیذ اور ریاست کے معاملات کو چلانے پر قادر ہے، وہ خلیفہ ہے، جب تک کہ اس کی حالت میں کوئی ایسی تبدیلی رونما نہ ہو جائے جو اسے منصبِ خلافت سے خارج کر دے۔ پس جب اس کی حالت میں کوئی ایسی تبدیلی واقع ہو جائے تو اسے فوراً معزول کرنا فرض ہو جاتا ہے۔

دفعہ نمبر40: وہ امور، جن کی وجہ سے خلیفہ کی حالت بدل جاتی ہے اور وہ منصبِ خلافت سے معزول ہو جاتا ہے، وہ یہ تین امور ہیں:

(1) جب انعقادِ خلافت کی شرائط میں سے کوئی شرط مفقود ہو جائے۔ جیسے مرتد ہونا، خلیفہ سے فسق کا ظہور ہو جانا، مجنون ہونا، یا اسی قسم کی کوئی دوسری صورت پیش آئے۔ کیونکہ یہ تمام شرائط خلافت کے انعقاد کی شرائط بھی ہیں اور خلافت کے دوام کی شرائط بھی۔

(2) خلیفہ کسی بھی سبب سے خلافت کے فرائض کی انجام دہی سے عاجز ہو جائے۔

(3) وہ اس قدر مغلوب ہو جائے کہ اپنی رائے سے شریعت کے موافق مسلمانوں کے مفادات کی حفاظت نہ کر سکے۔ پس جب اس پر کوئی اس حد تک غالب آ جائے کہ وہ احکامِ شرع کی روشنی میں بذاتِ خود اپنے اختیار وارادے سے، اپنی رائے کے مطابق رعایا کے مفادات کی نگرانی کرنے سے عاجز ہو جائے تو اسے حکماً فرائضِ خلافت کی ادائیگی سے عاجز سمجھا جائے گا۔ ایسی صورت میں وہ اس منصب کا اہل نہیں رہتا۔ اس کی دو صورتیں ہو سکتی ہیں:

پہلی صورت: اس کے حاشیہ برداروں میں سے کوئی ایک فرد یا ایک سے زائد افراد اس پر اس طرح مسلط ہو جائیں کہ اس پر اپنی رائے ٹھونس دیں۔ اس صورت میں اگر ان لوگوں سے چھٹکارا پانے کی امید ہو تو اسے ایک معینہ مدت تک مہلت دی جائے گی۔ پھر اگر وہ ان سے چھٹکارا حاصل کرنے میں کامیاب نہ ہو سکے تو اسے معزول کیا جائے گا۔ اگر شروع ہی سے چھٹکارہ پانے کی امید نہ ہو تو اسے اسی وقت معزول کیا جائے گا۔

دوسری صورت: وہ کسی زبردست دشمن کے ہاتھوں گرفتار ہو جائے۔ یہ گرفتاری خواہ بالفعل ہو یا وہ دشمن خلیفہ پر تسلط حاصل کر لے۔ اس صورت میں اگر بچ نکلنے کی امید ہو تو اسے مہلت دی جائے گی ورنہ اسے معزول کیا جائے گا۔ اگر شروع ہی سے خلاصی کی کوئی امید نہ ہو تو خلیفہ کو فوراً معزول کیا جائے گا۔

دفعہ نمبر 41: صرف محکمۃ المظالم ہی فیصلہ کر سکتا ہے کہ کیا خلیفہ کی حالت اس قدر بدل چکی ہے جس کی وجہ سے اب وہ خلافت کے منصب کا اہل نہیں رہا۔ صرف اور صرف محکمۃ المظالمی کو خلیفہ کے ہٹانے یا تنبیہہ کرنے کا اختیار حاصل ہے۔

معاونِ تفویض

دفعہ نمبر 42: خلیفہ اپنے لیے معاونِ تفویض مقرر کرے گا جو حکمرانی کی ذمہ داری اٹھائے گا۔ پس خلیفہ اسے اپنے رائے کے مطابق امور کی تدبیر کرنے اور اپنے اجتہاد کے مطابق معاملات نپٹانے کی ذمہ داری سونپے گا۔

جب خلیفہ کا انتقال ہو جاتا ہے تو معاونین کی ذمہ داری بھی ختم ہو جاتی ہے۔ وہ عبوری دور کے اختتام تک اپنا کام جاری رکھتے ہیں، یہاں تک کہ عبوری امیر کا دور اپنے اختتام کو پہنچ جائے۔

دفعہ نمبر43: معاونِ تفویض کے لیے بھی وہی شرائط ہوں گی جو خلیفہ کے لیے ہیں۔ یعنی وہ ایک آزاد، عاقل، بالغ، مسلمان اور مرد ہو۔ اس کے علاوہ اس کے لیے یہ شرط بھی ہے کہ وہ اپنی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کی صلاحیت رکھتا ہو۔

دفعہ نمبر44: معاونِ تفویض کو اختیارات سونپنے کی دو شرائط ہیں:

(1) اسے عمومی اختیار سونپا جائے۔

(2) اسے نیابت حاصل ہو۔ اس لیے خلیفہ کو لازماً یہ کہنا چاہیے کہ میں نے اپنے تمام اختیارات میں تمہیں اپنا نائب بنایا، یا وہ کوئی دوسرے الفاظ استعمال کرے جو عمومی اختیار اور نیابت کو ظاہر کرتے ہوں۔ یہ تقرر خلیفہ کو اس بات کی اجازت دیتا ہے کہ وہ معاونین کو مخصوص جگہوں کی طرف بھیجے یا انہیں ایک جگہ سے دوسرے جگہ یا دوسرے کام کی طرف بھیج دے، اس انداز سے جو خلیفہ کو اس کے کام میں مدد دے۔ اور یہ امر اس بات کا مقتضی نہیں کہ ان کی نئے سرے سے تقرری کی جائے کیونکہ یہ سب کام معاونین کے بنیادی تقرر میں شامل ہیں۔

دفعہ نمبر45: معاونِ تفویض پر لازم ہے کہ وہ جن امور کی تدبیر کرے یا جن احکام کو نافذ کرے، ان سے خلیفہ کو باخبر رکھے، تاکہ اختیارات کے استعمال میں خلیفہ اور اس کے درمیان فرق ہو۔ اس کا کام خلیفہ کو باخبر رکھنا اور خلیفہ جن چیزوں کی تنفیذ کا حکم دے، انہیں نافذ کرنا ہے۔

دفعہ نمبر46: خلیفہ کا فرض ہے کہ وہ معاونِ تفویض کے اعمال اور تدابیر کا جائزہ لے، تاکہ ان میں سے صحیح کو برقرار رکھے اور غلط کا تدارک کرے۔ کیونکہ اُمت کے معاملات کی نگرانی خلیفہ کی ذمہ داری اور اس کے اجتہاد پر موقوف ہے۔

دفعہ نمبر47: جب معاونِ تفویض کسی معاملے کی تدبیر کرے اور خلیفہ اس کی منظوری دے دے، تو معاون کو چاہیے کہ وہ اسے کسی کمی بیشی کے بغیر اسی طرح نافذ کرے جس طرح کہ خلیفہ نے منظوری دی تھی۔ اگر خلیفہ پھر اس معاملے کا جائزہ لے اور دیکھے کہ معاون نے اس امر کے خلاف عمل کیا ہے، تو دیکھا جائے گا کہ اگر یہ حکم کسی ایسے معاملے سے متعلق ہو جسے معاون نے خلیفہ کے نقطۂ نظر کے مطابق نافذ کیا ہو، یا یہ حکم کسی ایسے مال سے متعلق ہو جسے معاون نے خلیفہ کی طرف سے کر دیا ہو تو اس صورت میں معاون کی رائے نافذ العمل سمجھی جائے گی۔ کیونکہ یہ دراصل خلیفہ کی رائے تھی اور جو احکامات نافذ کیے گئے، یا جو اموال خرچ کیے گئے، خلیفہ اس کی تلافی نہیں کر سکتا۔ اگر جس معاملے کو معاون نے نپٹایا ہو، اس کا تعلق ایسے امور کے علاوہ کسی اور چیز کے ساتھ ہو، مثلاً کسی کو والی مقرر کرنا یا فوج تیار کرنا۔ تو اس صورت میں خلیفہ اس معاملے کو تبدیل کر سکتا ہے۔ اس صورت میں خلیفہ ہی کی رائے نافذ ہو گی اور معاون کا فیصلہ کالعدم سمجھا جائے گا۔ کیونکہ یہ ایسے اعمال ہیں کہ اگر یہ خود خلیفہ سے بھی صادر ہوئے ہوں تو تب بھی وہ ان کا تدارک کر سکتا ہے۔ لہٰذا ایسے معاملات میں خلیفہ اپنے معاون کے فیصلوں کی تلافی تو بطریقِ اولیٰ کر سکتا ہے۔

دفعہ نمبر48: معاونِ تفویض کو کسی خاص محکمے کے ساتھ مخصوص نہیں کیا جائے گا۔ کیونکہ اس کی نگرانی عام ہے۔ کیونکہ جو لوگ انتظامی معاملات کو پورا کرتے ہیں وہ ملازم ہوتے ہیں نہ کہ حکمران۔ جبکہ معاونِ تفویض حکمران ہے۔ اور اسے کسی خاص عمل کی سرانجام دہی کے ساتھ مخصوص کرنا درست نہیں کیونکہ اس کی تقرری عام ہے۔

معاونِ تنفیذ

دفعہ نمبر49: خلیفہ احکامات کی تنفیذ کے لیے معاون مقرر کرے گا۔ اس کا کام انتظامی امور سے متعلق ہوتا ہے اور اس کا کام حکمرانی کرنا نہیں ہوتا۔ اس کے دفتر کا کام خلیفہ کی جانب سے داخلی اور خارجی امور سے متعلق صادر ہونے والے

احکامات کو نافذ کرنا اور ان سے پیغامات کو خلیفہ تک پہنچانا ہے۔ گویا معاونِ تنفیذ خلیفہ اور دوسروں کے درمیان واسطے کا کام کرتا ہے۔ وہ خلیفہ کی طرف سے پیغام لاتا ہے اور خلیفہ کی طرف مندرجہ ذیل امور کے متعلق پیغام لے کر جاتا ہے:

ا) رعیت کے ساتھ تعلقات

ب) بین الاقوامی تعلقات

ج) فوج یا لشکر

د) فوج کے علاوہ دیگر ریاستی شعبوں کے متعلق پیغام رسانی

دفعہ نمبر50: معاونِ تنفیذ مسلمان ہوتا ہے، کیونکہ وہ خلیفہ کے قریبی مصاحبین میں سے ہوتا ہے۔

دفعہ نمبر51: معاونِ تنفیذ براہِ راست خلیفہ کے ساتھ ہوتا ہے، جس طرح کہ معاونِ تفویض ہوتا ہے۔ یہ صرف تنفیذ میں معاون ہوتا ہے، حکمرانی میں نہیں۔

والی (گورنرز)

دفعہ نمبر52: ان علاقوں کو، جو اسلامی ریاست کے زیرِ نگیں ہیں، کئی ایک اکائیوں میں تقسیم کیا جاتا ہے اور ہر اکائی کو ولایہ (صوبہ) کہا جاتا ہے۔ پھر ولایہ کو کئی اکائیوں میں تقسیم کیا جاتا ہے اور ہر اکائی کو عمالہ کہا جاتا ہے۔ ولایہ کے سربراہ کو والی یا امیر اور عمالہ کے سربراہ کو عامل یا حاکم کہا جاتا ہے۔

دفعہ نمبر53: والیوں کا تقرر خلیفہ کرتا ہے۔ عمال کا تقرر خلیفہ بھی کر سکتا ہے اور والی بھی بشرطیکہ خلیفہ یہ اختیار والیوں کے حوالے کرے۔ والیوں اور عاملوں کے لیے وہی شرائط ہیں جو معاونین کے لیے ہیں۔ چنانچہ ان

کا مسلمان، عاقل، بالغ، آزاد، عادل اور مرد ہونا لازمی ہے۔ جو کام ان کے حوالے کیے گئے ہیں ان سے عہدہ برآ ہونے کی اہلیت بھی شرط ہے۔ ان لوگوں کا انتخاب تقویٰ اور قوت کی بنیاد پر ہوگا۔

دفعہ نمبر 54: والی کو خلیفہ کے نائب کی حیثیت سے اپنے صوبے کے شعبوں کے تمام کاموں پر حکمرانی اور نگرانی کا اختیار حاصل ہوتا ہے۔ گویا والی کو اپنی ولایہ میں وہ تمام اختیارات حاصل ہیں جو معاونین کو ریاست میں حاصل ہیں، یعنی وہ اپنی ولایہ کا امیر ہے۔ مالیات، عدلیہ اور فوج کو چھوڑ کر ہر چیز پر اس کی نگرانی ہوگی، تاہم پولیس بطورِ تنفیذ اس کے ماتحت ہوگی اور بحیثیت ادارہ اس کے ماتحت نہیں ہوگی۔

دفعہ نمبر 55: والی اپنی امارت سے متعلقہ امور کے بارے میں جن فیصلوں یا احکامات پر دستخط کرے، ان کے بارے میں وہ خلیفہ کو مطلع کرنے کا پابند نہیں۔ ہاں! اختیاری طور پر اسے باخبر کر سکتا ہے۔ البتہ جب کوئی نیا مسئلہ درپیش ہو تو وہ خلیفہ کے علم میں لائے بغیر اس کا فیصلہ کرنے کا مجاز نہیں۔ لیکن اگر تاخیر کی صورت میں کسی معاملے کے بگڑ جانے کا خطرہ ہو تو اس معاملے کو طے کرے گا۔ پھر خلیفہ کو لازمی طور پر آگاہ کرے گا اور وہ اسباب بھی بتائے گا جن کی وجہ سے وہ معاملے کو طے کرنے سے قبل خلیفہ کو باخبر نہیں کر سکا۔

دفعہ نمبر 56: ہر ولایہ کے اندر ولایہ میں رہنے والوں میں سے ایک کمیٹی (مجلس) منتخب کی جائے گی، جس کا سربراہ خود والی ہوگا۔ اس کمیٹی کو انتظامی امور سے متعلق اپنی رائے کے اظہار کا اختیار ہوگا، جبکہ حکومتی معاملات سے متعلق اس کے پاس یہ اختیار نہیں ہوگا۔ اس کی اغراض دو ہیں:

اول: مجلس والی کو ولایہ اور اس کی ضروریات کے متعلق معلومات پیش کرے اور ان امور پر اپنی رائے دے۔

دوم: والی کی حکمرانی پر اپنی رضامندی یا شکایت کے اظہار کے لیے۔

پہلے معاملے میں (والی کے لیے) مجلس کی رائے پر عمل کرنا لازم نہیں، جبکہ دوسرے معاملے میں مجلس کی رائے پر عمل کرنا لازم ہے۔ پس اگر مجلس شکایت کرے تو والی کو معزول کر دیا جائے گا۔

دفعہ نمبر57: ایک ولایہ پر ایک ہی شخص کا طویل مدت تک والی کے طور پر خدمات سرانجام دینا مناسب نہیں۔ خاص طور پر جب کسی ایک ولایہ میں وہ مرکزی شخصیت بن جائے یا اس کی وجہ سے لوگوں کے فتنے میں پڑنے کا خطرہ ہو۔

دفعہ نمبر58: والی کا ایک ولایہ سے دوسری ولایہ میں تبادلہ نہیں کیا جائے گا، کیونکہ اسے مخصوص جگہ پر عمومی اختیار سونپا جاتا ہے۔ البتہ اسے معزول کر کے پھر دوسری جگہ پر والی مقرر کیا جا سکتا ہے۔

دفعہ نمبر59: جب خلیفہ والی کو معزول کرنا مناسب سمجھے تو اسے معزول کر سکتا ہے۔ یا پھر مجلسِ امت اس پر عدم اعتماد کا اظہار کر دے، یا مجلس اس سے ناراضگی کا اظہار کرے، تو اسے معزول کیا جائے گا۔ والی کو صرف خلیفہ ہی معزول کر سکتا ہے۔

دفعہ نمبر60: خلیفہ کا فرض ہے کہ وہ والیوں کے اعمال پر نظر رکھے اور ان کی کڑی نگرانی کرے۔ وہ ان پر نظر رکھنے کے لیے اپنے نائب مقرر کرے، ان کے بارے میں برابر تفتیش کرتا رہے، وقتاً فوقتاً تمام والیوں کا ایک ساتھ یا الگ الگ اجلاس بلاتا رہے اور والیوں کے بارے میں رعایا کی شکایتوں سے انہیں باخبر کرے۔

امیرِ جہاد: شعبۂ حرب-افواج

دفعہ نمبر61: شعبۂ حرب، مسلح افواج، پولیس، اسباب وذرائع، فوجی مہمات اور لڑائی کے ساز وسامان وغیرہ پر ذمہ دار ہوتا ہے۔ اسی طرح عسکری کالج، کمیشن، فوج کی اسلامی تربیت اور عسکری تربیت اور جنگ یا جنگی تیاری سے متعلق ہر کام کی ذمہ داری بھی شعبۂ حرب کے ذمے ہے۔

دفعہ نمبر62: جہاد مسلمانوں پر فرض ہے۔ چنانچہ فوجی تربیت لازمی ہے۔ لہٰذا ہر مسلمان مرد جب پندرہ سال کی عمر کو پہنچ جائے تو اس پر جہاد کی تیاری کے لیے فوجی تربیت حاصل کرنا فرض ہے۔ جہاں تک فوج میں بھرتی ہونے۔ کا تعلق ہے تو یہ فرضِ کفایہ ہے۔

دفعہ نمبر63: فوج کی دو اقسام ہیں۔ اول: احتیاطی (ریزرو) فوج؛ اس سے مراد وہ تمام مسلمان ہیں جو اسلحہ اٹھا سکتے ہیں۔ دوم: مستقل فوج؛ مستقل فوج کی تنخواہیں دیگر ملازمین کی طرح ریاستی بجٹ سے مختص کی جاتی ہیں۔

دفعہ نمبر64: فوج کے لیے اَلویہ (علم) اور رایات (جھنڈوں) کا تعین کیا جائے گا۔ ریاست کا سربراہ (خلیفہ) جسے فوج کا سربراہ بنائے گا، اسے علم عطا کرے گا، جبکہ جھنڈے بریگیڈ کمانڈرز تقسیم کریں گے۔

دفعہ نمبر65: خلیفہ فوج کا بھی قائد ہوتا ہے، اور وہی فوج کے کمانڈر انچیف کا تقرر بھی کرتا ہے۔ اسی طرح وہ ہر بریگیڈ اور ہر ڈویژن کے کمانڈر کا تقرر بھی کرتا ہے۔ فوج کی باقی ترتیب اس کے امراء اور بریگیڈ کمانڈر کرتے ہیں۔ جہاں تک فوج کے سٹاف کمانڈرز کا تعلق ہے تو ان کا تقرر جنگی تربیت (ثقافت) کی بنیاد پر ہوگا اور انہیں کمانڈر انچیف مقرر کرے گا۔

دفعہ نمبر66: پوری فوج ایک اکائی ہے اور اسے مختلف چھاؤنیوں میں رکھا جاتا ہے۔ یہ چھاؤنیاں مختلف ولایات (صوبوں) میں ہوتی ہیں اور بعض چھاؤنیاں جنگی حکمت عملی کے مقامات پر ہوتی ہیں۔ اسی طرح کچھ چھاؤنیاں ہمیشہ متحرک رہتی ہیں اور یہ بے پناہ جنگی قوت کی حامل ہوتی ہیں۔ ان چھاؤنیوں کو کئی ایک مجموعوں میں منظم کیا جاتا ہے۔ پھر ہر مجموعے کا ایک خاص فوجی نام رکھا جاتا ہے اور اس کا ایک خاص نمبر ہوتا ہے۔ جیسے یونٹ نمبر 1، نمبر 2، نمبر 3 وغیرہ یا انہیں صوبوں اور شہروں کے نام کے ساتھ موسوم کیا جاتا ہے۔

دفعہ نمبر67: فوج کے لیے اعلیٰ معیار کی عسکری تعلیم کو ممکن بنانااور جس قدر ہو سکے اسے فکری طور پر بلند کرنا ضروری ہے۔ فوج کے ہر سپاہی کو اسلامی ثقافت سے بہرہ ور کیا جانا چاہیے، تاکہ اس کے اندر اسلامی بیداری ہو، خواہ یہ اجمالی شکل ہی میں کیوں نہ ہو۔

دفعہ نمبر68: یہ امر انتہائی ضروری ہے کہ ہر چھاؤنی میں ایسے کمانڈروں کی کافی وشافی تعداد موجود ہو، جو فوجی اور جنگی امور کے ماہر ہوں۔ جو جنگی منصوبہ بندی اور معرکوں کے بارے میں مہارت رکھتے ہوں۔ ایسے کمانڈروں کا تناسب فوج میں ممکن حد تک زیادہ سے زیادہ ہونا چاہیے۔

دفعہ نمبر69: فوج کے پاس وافر مقدار میں اسلحہ، آلات، ضروری ساز وسامان اور لوازمات کا ہونا انتہائی ضروری ہے تاکہ ایک اسلامی فوج کے طور پر اس کے فریضے کی ادائیگی میں یہ چیزیں اس کے لیے مدد ومعاون ثابت ہوں۔

شعبۂ داخلی امن وسلامتی

دفعہ نمبر70: شعبۂ داخلی امن وسلامتی، وہ شعبہ ہے جو امن وامان سے متعلق ہر چیز کا ذمہ دار ہے، اور ہر اس چیز کو روکنے کا ذمہ دار ہے جو داخلی امن وسلامتی کے لیے خطرے کا باعث ہو۔ امن کی حفاظت پولیس کے ذریعے کی جائے گی۔ شعبۂ امن وسلامتی فوج کو اس مقصد کے لیے استعمال نہیں کر سکتا، ماسوائے خلیفہ اسے اس بات کی اجازت دیدے۔ اس شعبے کا سربراہ ''ڈائریکٹر برائے داخلی امن وسلامتی'' ہوگا۔ ہر صوبے میں اس شعبے کی شاخ ہوگی جو ''داخلی امن وسلامتی کا ادارہ'' کہلائے گی اور اس کا سربراہ ''صاحبِ شُرطہ'' کہلائے گا۔

دفعہ نمبر71: پولیس کی دو قسمیں ہیں: ملٹری پولیس جو کہ امیر جہاد یعنی شعبۂ حرب کے تابع ہوگی۔ پولیس کی دوسری قسم جو کہ امن وسلامتی کے تحفظ کے لیے عدلیہ کے ہاتھ میں ہوگی، اور یہ ''شعبۂ امن وسلامتی'' کے تابع ہوگی۔ پولیس کی ان دونوں قسموں کو خاص تربیت اور ثقافت دی جاتی ہے تاکہ وہ اپنی ذمہ داریوں کو احسن طریقے سے پورا کر سکیں۔

دفعہ نمبر72: شعبۂ داخلی امن وسلامتی بنیادی طور پر جن خطرات کی روک تھام کرے گا، وہ یہ ہیں: ارتداد، بغاوت اور حرابہ، لوگوں کی مال ودولت پر حملہ، لوگوں کی جان اور عزت پر دست درازی اور ان مشتبہ لوگوں سے نبٹنا، جو حربی کفار کے لیے جاسوسی کرتے ہیں۔

شعبۂ خارجہ

دفعہ نمبر73: شعبۂ خارجہ ان تمام خارجی امور کو سرانجام دیتا ہے، جن کا تعلق ریاستِ خلافت کے دیگر ریاستوں کے ساتھ تعلق کے ساتھ ہے۔ خواہ یہ تعلقات سیاسی نوعیت کے ہوں یا اقتصادی یا صنعتی یا زرعی یا تجارتی نوعیت کے؛ یا ان تعلقات کی نوعیت مواصلاتی رابطہ کی ہو، خواہ یہ رابطہ ڈاک کے ذریعے ہو یا یہ ٹیلی کمیونیکیشن رابطہ ہو یا کوئی اور۔

شعبۂ صنعت

دفعہ نمبر74: شعبۂ صنعت وہ محکمہ ہے جو صنعت سے متعلق تمام امور کا ذمہ دار ہے۔ خواہ اس کا تعلق بھاری صنعت سے ہو جیسے انجن اور آلات سازی، گاڑیوں کے ڈھانچے، الیکٹرونک آلات اور دیگر اشیاء کی صنعت یا پھر یہ ہلکی (چھوٹی) صنعت ہو۔ وہ کارخانے جن کا حربی (جنگی) صنعت سے تعلق ہو، اس شعبے کے تحت آتے ہیں۔ خواہ ان کارخانوں میں تیار کردہ مال عام ملکیت سے تعلق رکھتا ہو یا انفرادی ملکیت سے۔ تمام کارخانے جنگی پالیسی کی بنیاد پر استوار ہونے چاہئیں۔

عدلیہ

دفعہ نمبر75: عدلیہ کسی معاملے پر فیصلہ صادر کرتی ہے تاکہ اسے نافذ کیا جائے۔ عدلیہ کے ذریعے لوگوں کے باہمی جھگڑوں کا فیصلہ کیا جاتا ہے یا ان چیزوں کا سدباب کیا جاتا ہے جو جماعت (معاشرہ) کے حق میں نقصان دہ ہیں یا رعایا اور

حکمرانوں کے درمیان پائے جانے والے کسی بھی تنازع کو دور کیا جاتا ہے، خواہ وہ حاکم ہو یا سرکاری ملازم ہو یا خلیفہ ہو یا کوئی اور شخص۔

دفعہ نمبر76: خلیفہ کسی ایسے شخص کو قاضی القضاۃ مقرر کرتا ہے، جو مرد، عاقل، بالغ، آزاد، عادل اور مسلمان ہو اور وہ فقیہ بھی ہو، پھر انتظامی قوانین کے اندر رہتے ہوئے دوسرے قاضیوں کو مقرر کرنا، ان سے بازپرس کرنا اور انہیں معزول کرنا قاضی القضاۃ کا کام ہے۔ جہاں تک محکمہ قضاۃ کے دیگر ملازمین کا تعلق ہے تو یہ ایک علیحدہ انتظامی ادارے کا کام ہے، جو ان کے معاملات کی نگرانی کرتا ہے۔

دفعہ نمبر77: قاضیوں کی تین اقسام ہیں:

(1) قاضی: جو لوگوں کے درمیان معاملات اور عقوبات سے متعلق جھگڑوں کا فیصلہ کرتا ہے۔

(2) قاضی محتسب: اس کا کام ان اختلافات کا فیصلہ کرنا ہوتا ہے جو جماعت (معاشرہ) کو نقصان پہنچاتی ہیں۔

(3) قاضی مظالم: اس کا کام عوام اور حکومت کے درمیان پیدا ہونے والے تنازعات کا فیصلہ کرنا ہے۔

دفعہ نمبر78: جس شخص کو قاضی کی ذمہ داری سونپی جائے اس کے لیے شرط ہے کہ وہ مسلمان، آزاد، بالغ، عاقل، عادل، فقیہ اور ان واقعات سے متعلق اسلامی احکامات کا ادراک کرنے والا ہو۔ قاضی مظالم کے لیے ان شرائط کے علاوہ دو اور شرائط بھی ہیں اور وہ یہ ہیں کہ قاضی مظالم مرد اور مجتہد بھی ہو۔

دفعہ نمبر79: یہ بات جائز ہے کہ قاضی اور محتسب کو ہر علاقے میں تمام فیصلے کرنے کی ذمہ داری سونپی جائے اور یہ بھی جائز ہے کہ کسی خاص علاقے میں خاص قسم کے مقدمات کی ذمہ داری اس کے حوالہ کی جائے۔

دفعہ نمبر80: عدالت صرف ایک ایسے قاضی پر مشتمل ہو گی جسے مقدمات کے فیصلے کا اختیار ہو گا۔ اس کے ساتھ دوسرے قاضی بھی ہو سکتے ہیں، لیکن انہیں فیصلے کا اختیار حاصل نہیں ہو گا، بلکہ وہ صرف مشورہ اور اپنی رائے دے سکتے ہیں۔ان کی رائے پر چلنا بھی قاضی پر لازم نہیں۔

دفعہ نمبر81: قاضی کے لیے عدالت کے علاوہ کہیں اور فیصلہ کرنا جائز نہیں نیز گواہی اور قَسم بھی وہی معتبر ہو گی، جو عدالت میں دی گئی ہو۔

دفعہ نمبر82: فیصلوں کی نوعیت کے اعتبار سے عدالتوں کی درجہ بندی ہو سکتی ہے۔ چنانچہ بعض قاضیوں کو کچھ خاص نوعیت کے معاملات کے فیصلوں کے لیے مخصوص کیا جا سکتا ہے۔ان کے علاوہ دیگر امور کو دوسری عدالتوں کے سپرد کیا جا سکتا ہے۔

دفعہ نمبر83: اپیل کورٹ، سیشن کورٹس کا کوئی وجود نہیں ہوتا۔ کسی مقدمے کا فیصلہ ایک ہی مرتبہ اور اٹل ہوتا ہے۔ جب قاضی کسی فیصلے کا اعلان کرے تو وہ اسی وقت نافذ العمل ہو جاتا ہے، کسی بھی دوسرے قاضی کا فیصلہ اس فیصلے کو ختم نہیں کر سکتا، ماسوائے جب وہ قاضی اسلام کے علاوہ کسی اور بنیاد پر فیصلہ دے یا کتاب و سنت یا اجماع صحابہ کی قطعی نص کے خلاف فیصلہ دے، یا اس کا فیصلہ واقعہ کی حقیقت کے خلاف ہو۔

دفعہ نمبر84: قاضی محتسب وہ قاضی ہوتا ہے جو ایسے تمام مقدمات پر نظر رکھتا ہے جن کا تعلق حقوقِ عامہ سے ہو اور جن میں مدعی نہ ہو، بشرطیکہ وہ حدود اور جنایات میں داخل نہ ہوں۔

دفعہ نمبر85: محتسب کو جیسے ہی کسی واقعہ کا علم ہو تو وہ فوراً اس کے بارے میں حکم صادر کر سکتا ہے، خواہ کسی بھی جگہ پر ہو۔اسے فیصلہ صادر کرنے کے لیے مجلسِ عدالت کی ضرورت نہیں۔ اس کے احکامات کو نافذ کرنے کے لیے اس کے ماتحت پولیس کے افراد ہوں گے اور اس کا حکم فوری طور پر نافذ العمل ہو گا۔

دفعہ نمبر86: محتسب اپنے لیے ایسے نائب منتخب کر سکتا ہے جو محتسب ہونے کی شرائط پر پورا اترتے ہوں۔ وہ انہیں مختلف علاقوں میں پھیلا دے گا۔ ان نائبین کو اپنے اپنے علاقوں یا محلوں میں جن امور کے فیصلے سپرد کیے جائیں ان کے متعلق محتسب کا فریضہ سرانجام دینے کا مکمل اختیار حاصل ہوتا ہے۔

دفعہ نمبر87: قاضی مظالم وہ قاضی ہوتا ہے جس کا تقرر ریاست کے زیرِ سایہ زندگی گزارنے والے ہر شخص پر ہونے والے ریاستی ظلم کا تدارک کرنے کے لیے ہوتا ہے۔ خواہ وہ شخص ریاست کی رعایا میں سے ہو یا نہ ہو۔ یہ ظلم خواہ ریاست کے سربراہ کی طرف سے ہو یا اس کے علاوہ کسی اور حاکم یا سرکاری ملازم کی طرف سے۔

دفعہ نمبر88: خلیفہ یا قاضی القضاۃ، قاضی مظالم کا تقرر کرے گا۔ جہاں تک قاضی مظالم کے محاسبہ، اس کی بازپرس یا اسے ہٹانے کا تعلق ہے تو یہ خلیفہ یا قاضی القضاۃ کرتا ہے، بشرطیکہ خلیفہ نے قاضی القضاۃ کو یہ اختیار دیا ہو۔ لیکن جب وہ خلیفہ، معاونِ تفویض یا مذکورہ قاضی القضاۃ کے ظلم پر غور کر رہا ہو تو اس وقت اسے سبکدوش کرنا درست نہیں۔ اس صورت میں یہ اختیار محکمۃ المظالم کو حاصل ہو گا۔

دفعہ نمبر89: قاضی مظالم کوئی ایک شخص یا چند افراد نہیں بنتے بلکہ ریاست کا سربراہ مظالم کو ختم کرنے کے لیے حسبِ ضرورت جتنی تعداد مقرر کرنا چاہے، کر سکتا ہے۔ لیکن براہِ راست فیصلے کے دوران صرف ایک قاضی کو فیصلے کا اختیار ہو گا۔ فیصلے کی مجلس میں متعدد قاضی مظالم کا بیٹھنا جائز ہے۔ لیکن انہیں صرف مشورے کا اختیار ہو گا۔ اس (فیصلے کرنے والے قاضی) کے لیے ان کی رائے پر عمل کرنا بھی لازمی نہیں۔

دفعہ نمبر90: محکمۃ المظالم کو ریاست کے کسی بھی حاکم یا ملازم کو معزول کرنے کا حق حاصل ہے، جیسا کہ اسے خلیفہ کو معزول کرنے کا حق بھی حاصل ہے۔ اور یہ اس صورت میں ہے، جب اس ظلم کو دور کرنے کے لیے خلیفہ کو ہٹانا لازمی ہو جائے۔

دفعہ نمبر91: محکمۃ المظالم کسی بھی قسم کے ظلم کا جائزہ لینے کا اختیار رکھتا ہے۔ خواہ یہ ظلم ریاستی ڈھانچے کے افراد سے متعلق ہو یا خلیفہ کی جانب سے احکامِ شریعت کی مخالفت کے حوالے سے ہو یا خلیفہ کے تبنی کیے ہوئے دستور و قانون یا دوسرے شرعی احکامات کے تعین کے سلسلے میں کسی شرعی نص کی مخالفت کے متعلق ہو، یا پھر اس کا تعلق ٹیکس کے نفاذ وغیرہ سے ہو۔

دفعہ نمبر92: محکمۃ المظالم، میں نہ تو مجلسِ عدالت کا ہونا شرط ہے اور نہ ہی مدعی علیہ کو بلانے یا کسی مدعی کی موجودگی شرط ہے۔ بلکہ محکمۃ المظالم کو ظلم پر نظر رکھنے کا حق ہے، خواہ کوئی بھی دعویٰ نہ کرے۔

دفعہ نمبر93: ہر انسان کو جھگڑے (خصومت) اور دفاع دونوں صورتوں میں کسی کو اپنا وکیل بنانے کا حق حاصل ہے۔ خواہ وہ (وکیل) مسلمان ہو یا غیر مسلم، مرد ہو یا عورت۔ اس معاملے میں وکیل اور مؤکل میں کوئی فرق نہیں ہوگا۔ وکیل کے لیے اپنی وکالت کی اجرت لینا جائز ہے۔ اجرت دونوں (وکیل اور مؤکل) کی رضامندی سے مقرر ہوگی۔

دفعہ نمبر94: ہر وہ شخص، جو خاص اعمال کو انجام دینے کا اختیار رکھتا ہو، مثلاً وصی (نگران) اور ولی (سرپرست) یا اس کے پاس اعمالِ عامہ کی انجام دہی کا اختیار ہو، جیسے خلیفہ کا مقرر کردہ سربراہ، حاکم، ملازم، قاضی مظالم اور محتسب، تو وہ اپنے دفاع یا جھگڑے (خصومت) کے لیے کسی کو اپنا وکیل بنا سکتا ہے۔ یہ وکالت بھی وصی، ولی یا خلیفہ یا حاکم یا ملازم یا قاضی مظالم اور محتسب کے اعتبار سے ہوگی۔ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ وہ مدعی ہو یا مدعی علیہ۔

دفعہ نمبر95: وہ معاہدات، معاملات اور مقدمات جو کہ خلافت سے قبل ہوئے اور ان کے متعلق فیصلوں کو خلافت کے قیام سے قبل نافذ کیا جا چکا، خلافت کی عدلیہ انہیں منسوخ نہیں کرے گی اور ان پر نظر ثانی نہیں کرے گی، ماسوائے:

ا) اسلام کے خلاف ان کا اثر اب بھی موجود ہو۔ ایسی صورت میں ان پر نظر ثانی واجب ہوگی۔

ب) جب کسی فیصلے کا تعلق اسلام اور مسلمانوں کو نقصان پہنچانے سے ہو، جو کہ گذشتہ حکمرانوں یا ان کے حواریوں سے وقوع پزیر ہوئے ہوں۔ ایسی صورت میں خلیفہ کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ دوبارہ ان مقدمات کی سماعت کرے۔

انتظامی ڈھانچہ

دفعہ نمبر96: ریاستی امور کو چلانے اور لوگوں کے مفادِ عامہ کا تحفظ کرنے کے لیے مختلف محکمے، شعبے اور ادارے ہوتے ہیں، جن کی ذمہ داری ریاست کے مسائل کو حل کرنا اور لوگوں کی ضروریات پوری کرنا ہے۔

دفعہ نمبر97: مفادِ عامہ کے محکمے، شعبے اور ادارے نظام میں سادگی، ذمہ داریوں کو جلدی نبٹانے اور اہلیت کی پالیسی کی بنیاد پر قائم ہوں گے۔

دفعہ نمبر98: ہر اس شہری کو، جس کے اندر اہلیت ہو، خواہ وہ مرد ہو یا عورت، مسلمان ہو یا غیر مسلم، مفادِ عامہ کے کسی شعبے یا کسی ادارے کا سربراہ مقرر کیا جاسکتا ہے اور وہ اس ادارے میں ملازم ہو سکتا ہے۔

دفعہ نمبر99: ہر مصلحہ (محکمے) کا ایک منتظم اعلیٰ ہو گا اور ہر شعبے اور ادارے کا ایک سربراہ (ڈائریکٹر) ہو گا جو اس شعبے یا ادارے کے معاملات کو چلائے گا اور وہ اس پر براہِ راست ذمہ دار ہو گا۔ یہ ڈائریکٹرز اپنے کام کے متعلق، منتظمِ اعلیٰ کو جواب دہ ہوں گے جو کہ مختلف شعبوں، اداروں اور انتظامیہ پر ذمہ دار ہوتے ہیں جبکہ قوانین اور عمومی ضابطوں کے متعلق وہ ڈائریکٹرز والی اور عامل کو جواب دہ ہوں گے۔

دفعہ نمبر100: مفادِ عامہ کے محکموں، شعبوں اور اداروں کے سربراہ صرف کسی انتظامی سبب کی بنا پر ہی معزول کیے جاسکیں گے۔ البتہ انہیں ایک کام سے فارغ کر کے دوسرے کام پر لگانا جائز ہے۔ انہیں کسی کام سے روکنا بھی جائز ہے۔

ان کا تقرر، ان کی تبدیلی، انہیں کام سے روکنا، ان کی بازپرس کرنا اور انہیں سبکدوش کرنا ان کے ادارے یا ان کے محکمے کے اعلیٰ انتظامی سربراہ (منتظمِ اعلیٰ) کا کام ہے۔

دفعہ نمبر 101: سربراہوں کے سوا جو ملازمین ہیں، ان کا تقرر، ان کی تبدیلی، انہیں کام سے روکنا، ان کی اصلاح اور انہیں ہٹانے کی ذمہ داری ان کے محکموں، شعبوں یا اداروں کے منتظمِ اعلیٰ کے سر ہے۔

بیت المال

دفعہ نمبر 102: بیت المال کا شعبہ حاصل ہونے والے اموال اور ان کے تصرف کا انتظام احکامِ شریعت کے مطابق کرے گا، یعنی ان کا جمع کرنا، ان کی حفاظت اور انہیں خرچ کرنا۔ شعبۂ بیت المال کا سربراہ ''خازن بیت المال'' کہلاتا ہے۔ ہر ولایہ میں بیت المال کی شاخیں ہوں گی اور ہر شاخ کا سربراہ ''صاحبِ بیت المال'' کہلائے گا۔

میڈیا

دفعہ نمبر 103: میڈیا وہ شعبہ ہے جو ریاست کی میڈیا پالیسی وضع کرتا ہے اور اسے نافذ کرتا ہے تاکہ اسلام اور مسلمانوں کے مفاد کو پورا کیا جائے۔ داخلی طور پر یہ ایک قوی اور متحد و مربوط اسلامی معاشرے کی تشکیل کرتا ہے، جو خباثت کو نکال باہر کرے اور طیب چیزوں کو فروغ دے۔ اور خارجی طور پر یہ اسلام کو امن اور جنگ کے دوران اس انداز میں پیش کرتا ہے، جو اسلام کی عظمت، اس کے عدل اور اس کی فوجی قوت کو ظاہر کرے، اور انسانوں کے بنائے ہوئے نظاموں کے فساد اور ظلم کو بیان کرے اور ان کی افواج کی کمزوری کو آشکار کرے۔

دفعہ نمبر 104: وہ لوگ جن کے پاس ریاست کی شہریت موجود ہے، انہیں اپنا میڈیا کھولنے کی اجازت ہے۔ اس بات کے لیے انہیں ریاست کی اجازت کی ضرورت نہیں، بلکہ ''علم و خبر'' (یعنی میڈیا کے شعبہ کو اطلاع دے دینا) ہی کافی ہے کہ وہ کس نوعیت کا میڈیا کھولنا چاہ رہا ہے۔ اس میڈیا کا مالک اور ایڈیٹر اس پر نشر ہونے والی ہر میڈیا خبر کے ذمہ دار

ہوں گے۔اور ریاست کے کسی بھی شہری کی مانند، میڈیا پر نشر یا شائع ہونے والی کسی چیز کے شریعت کے خلاف ہونے پر انکا بھی محاسبہ کیا جائے گا۔

مجلسِ امت

دفعہ نمبر105: وہ افراد، جو رائے کے لحاظ سے مسلمانوں کی نمائندگی کرتے ہیں، جن کی طرف خلیفہ رجوع کرتا ہے، انہیں مجلسِ امت کہا جاتا ہے۔ حکمرانوں کے مظالم کی شکایت یا اسلامی احکامات کو غلط طریقے سے نافذ کرنے پر شکایت کی غرض سے غیر مسلم بھی مجلسِ امت کا رکن بن سکتے ہیں۔

دفعہ نمبر106: ہر ولایہ میں رہنے والے لوگ اپنی مجلسِ ولایہ کے اراکین کا چناؤ براہِ راست انتخاب کے ذریعے کریں گے۔ ولایات کی مجالس کے ممبران کی تعداد ولایہ میں رہنے والے لوگوں کی تعداد کی بنا پر ہو گی۔ مجلسِ اُمت کے ممبران کا چناؤ ان مجالسِ ولایات سے براہِ راست کیا جائے گا۔ مجلسِ امت کے ابتدا اور انتہاء کی مدت وہی ہو گی جو کہ ولایات کی مجالس کی ہو گی۔

دفعہ نمبر107: ہر عاقل و بالغ شخص، جو ریاست کا شہری ہو، کو مجلسِ امت کا رکن بننے کا حق حاصل ہے۔ خواہ مرد ہو یا عورت، مسلمان ہو یا کافر، البتہ غیر مسلم رکن کا مشورہ حکام کے مظالم یا ان پر اسلامی احکامات کی غلط طریقے سے تنفیذ کی شکایت تک محدود ہو گا۔

دفعہ نمبر108: شوریٰ اور مَشورہ کا مطلب مطلق انداز میں رائے لینا ہے اور جب عملی معاملات کے متعلق رائے لی جائے تو اس پر عمل کرنا لازم ہوتا ہے۔ جبکہ قانون کو مرتب کرنا، قوانین کی تعریف، فکری امور جیسے حقائق سے پردہ اٹھانا اور فنی اور سائنسی امور کے متعلق مشورے پر عمل کرنا خلیفہ کے لیے لازم نہیں۔

دفعہ نمبر109: شوریٰ صرف مسلمانوں کا حق ہے۔اس میں غیر مسلموں کا کوئی حق نہیں۔ لیکن اظہارِ رائے کا حق رعایا کے تمام افراد کو حاصل ہے، خواہ وہ مسلم ہوں یا غیر مسلم۔

دفعہ نمبر110: وہ مسائل جو عملی معاملات کے تحت آتے ہوں اور ان کے متعلق مشورہ لیا جائے تو پھر ایسی صورت میں اکثریت کی رائے کو اختیار کیا جائے گا، قطع نظر اس کے کہ وہ درست ہے یا غلط۔ وہ معاملات جن کا تعلق قوانین مرتب کرنے، فکری امور، فنی امور یا تعریفات سے ہو ان میں دیکھا جائے گا کہ درست کیا ہے۔اور اس بات کو نظر انداز کر دیا جائے گا کہ یہ اکثریت کی رائے ہے یا اقلیت کی۔

دفعہ نمبر111: مجلسِ امت کو پانچ اختیارات حاصل ہوں گے:

1)(ا) خلیفہ مجلسِ امت سے مشورہ کرے گا اور مجلسِ امت خلیفہ کو عملی اقدام اور ان عملی معاملات اور امور میں مشورہ دے گی، جن کا تعلق لوگوں کے امور کی دیکھ بھال سے متعلق اندرونی پالیسی سے ہو اور جس میں گہری نظر اور جانچ پڑتال کی ضرورت نہیں ہوتی جیسا کہ حکومت کو چلانا، تعلیم، صحت، تجارت، صنعت، زراعت وغیرہ۔ایسی صورت میں خلیفہ کے لیے مجلس کی رائے پر عمل کرنا لازم ہو گا۔

(ب) وہ معاملات جن کا تعلق فکری امور سے ہے، جن کے لیے گہری نظر اور جانچ پڑتال کی ضرورت ہوتی ہے، اور وہ معاملات جو تجربہ اور علم کے محتاج ہیں، نیز سائنسی اور ٹیکنکل امور، مالیاتی امور، افواج اور خارجہ پالیسی سے متعلق امور، ان تمام معاملات میں خلیفہ مشورے کے لیے مجلسِ اُمت کی طرف رجوع کرے گا اور ان معاملات میں مجلس کی رائے پر عمل کرنا خلیفہ پر لازم نہیں۔

2) خلیفہ دستور اور قوانین کے لیے جن احکامات کی تبنی کا ارادہ کرے تو اسے چاہیے کہ ان احکامات کو مجلسِ امت کے سامنے رکھے۔ مجلسِ امت کے مسلم اراکین کو ان کے بارے میں بحث ومباحثے کا حق حاصل ہے،

اور یہ کہ وہ ان احکامات کے درست اور غلط پہلوؤں کو بیان کریں۔ اور اگر وہ خلیفہ کے ساتھ اس امر میں اختلاف کریں کہ خلیفہ کا طریقۂ تبنی، احکامِ شریعت کی تبنی سے متعلق ریاست کے طریقہ کے مخالف ہے، تو یہ معاملہ محکمۃ المظالم کے سامنے پیش ہوگا اور اس میں محکمۃ المظالم کی رائے پر عمل کرنا لازم ہوگا۔

3) مجلسِ امت کو تمام معاملات میں ریاست کے محاسبہ کا حق حاصل ہے۔ خواہ ان کا تعلق خارجہ امور سے ہو یا یہ داخلی امور ہوں یا یہ مالیات، فوج یا دیگر امور سے متعلق ہوں۔ اس سلسلے میں مجلس کی رائے کو اختیار کرنا لازمی ہوگا، اگر ان معاملات کا تعلق ایسے امور سے ہو جس میں اکثریت کی رائے کو اختیار کرنا لازم ہوتا ہے۔ اور اگر اس معاملے کا تعلق ان امور سے ہو جس میں اکثریت کی رائے پر عمل کرنا لازم نہیں ہوتا، تو مجلس کی رائے پر عمل کرنا لازمی نہ ہوگا۔

اور اگر مجلس خلیفہ کے ساتھ کسی ایسے عمل پر شرعی نقطہ نظر کی بناء پر اختلاف کرے، جو کہ اپنے انجام کو پہنچ چکا ہے، تو پھر اس صورت میں محکمۃ المظالم کی طرف رجوع کیا جائے گا۔ اور محکمۃ المظالم اس بات کا فیصلہ کرے گا کہ یہ فیصلہ شرعی تھا یا نہیں اور محکمۃ المظالم کی رائے پر عمل کرنا لازم ہوگا۔

4: مجلسِ امت والیوں اور معاونین اور عمال کے بارے میں ناپسندیدگی (عدمِ اعتماد) کا اظہار کر سکتی ہے۔ اس معاملے میں اس کی رائے پر عمل کرنا ضروری ہوگا اور خلیفہ پر لازم ہے کہ وہ فوراً انہیں معزول کر دے۔ اور اگر اس معاملے میں مجلسِ امت کی رائے اُس ولایہ کی مجلسِ ولایہ کی رائے کے خلاف ہو تو اس صورت میں مجلسِ ولایہ کی رائے مقدم ہوگی۔

5: مجلسِ امت کے مسلمان اراکین کو خلافت کے امیدواروں کی کانٹ چھانٹ کرنے کا حق حاصل ہے، جن کے متعلق محکمۃ المظالم نے فیصلہ دے دیا ہو کہ وہ شروطِ انعقاد پر پورا اترتے ہیں۔ اس معاملے میں مجلس کی

رائے پر عمل کرنا لازم ہے اور مجلس کے کانٹ چھانٹ کردہ امیدواروں کے سوا کسی کا انتخاب درست نہ ہو گا۔

معاشرتی نظام

دفعہ نمبر112: بنیادی طور پر عورت ماں ہے اور گھر کی ذمہ دار ہے۔ وہ ایک ایسی آبرو (عصمت) ہے، جس کی حفاظت فرض ہے۔

دفعہ نمبر113: بنیادی اصول یہ ہے کہ مرد اور عورت الگ الگ ہوں اور وہ کسی ایسی ضرورت کے سوا اکٹھے نہیں ہو سکتے ہیں جس کی شریعت نے اجازت دی ہو اور جس (شرعی ضرورت) کے لیے اجتماع ناگزیر ہو، مثلاً تجارت کے لیے یا حج کے لیے۔

دفعہ نمبر114: عورت کے بھی وہی حقوق ہیں جو مرد کے ہیں اور عورت پر بھی وہی فرائض ہیں جو مرد پر ہیں، ماسوائے جو اسلام نے اس کے ساتھ خاص کیے ہیں۔ اسی طرح مرد کے بھی کچھ خاص فرائض ہیں جو شرعی دلائل سے ثابت ہیں۔ چنانچہ عورت کو تجارت، زراعت اور صنعت کا حق حاصل ہے۔ وہ عقود اور معاملات کی نگرانی کر سکتی ہے۔ اسے ہر قسم کی ملکیت کا بھی حق حاصل ہے۔ وہ اپنے اموال کو خود یا کسی کے ذریعے ترقی دے سکتی ہے۔ زندگی کے تمام معاملات (مسائل) کو خود براہِ راست نپٹا سکتی ہے۔

دفعہ نمبر115: سرکاری ملازمتوں پر عورت کا تقرر جائز ہے۔ محکمۃ المظالمکو چھوڑ کر عدلیہ کی باقی ذمہ داریاں سنبھالنا بھی اس کے لیے جائز ہے۔ عورت مجلسِ اُمت کے لیے اراکین منتخب کر سکتی ہے اور خود بھی اس کی رکن بن سکتی ہے۔ اسی طرح خلیفہ کے انتخاب اور اس کی بیعت میں بھی شریک ہو سکتی ہے۔

دفعہ نمبر116: عورت حکمران نہیں بن سکتی۔ چنانچہ وہ خلیفہ، محکمۃ المظالم کا قاضی، والی، عامل اور کوئی ایسا عہدہ قبول نہیں کر سکتی، جس پر حکمرانی کا اطلاق ہوتا ہو۔ اسی طرح عورت کے لیے قاضی القضاۃ بننا، محکمۃ المظالم کا قاضی بننا یا امیرِ جہاد بننا جائز نہیں۔

دفعہ نمبر117: عورت کی زندگی دو دائروں میں ہے: پبلک لائف اور پرائیویٹ لائف۔ چنانچہ پبلک لائف میں وہ عورتوں، محرم اور غیر محرم مردوں کے ساتھ زندگی گزارتی ہے۔ لیکن اس کی شرط یہ ہے کہ اس صورت میں اس کا چہرہ اور ہتھیلیوں کے سوا دوسرا کوئی عضو ظاہر نہ ہو، نہ اظہارِ زینت ہو اور نہ بے پردگی ہو۔ جبکہ پرائیویٹ لائف میں عورت کے لیے صرف عورتوں اور اپنے محارم کے ساتھ زندگی گزارنا جائز ہے۔ اس صورت میں اجنبی مردوں کے ساتھ رہنا جائز نہیں۔ زندگی گزارنے کی ان دونوں صورتوں میں وہ احکامِ شریعت کی پابند ہے۔

دفعہ نمبر118: عورت کے لیے غیر محرم کے ساتھ تنہائی میں موجود ہونا ممنوع ہے۔ اسی طرح غیروں کے سامنے اظہارِ زینت اور اپنے ستر کو کھولنا بھی ممنوع ہے۔

دفعہ نمبر119: مرد اور عورت دونوں کو ہر اس کام سے روکا جائے گا جو اخلاق کے لیے خطرناک ہو اور معاشرے کے فساد کا سبب ہو۔

دفعہ نمبر120: ازدواجی زندگی اطمینان کی زندگی ہونی چاہیے اور زوجین کے درمیان رفاقت ہونی چاہیے۔ شوہر کے عورت پر قوام ہونے کا مطلب عورت کی دیکھ بھال ہے، نہ کہ عورت پر حکمرانی کرنا۔ بیوی پر شوہر کی اطاعت فرض ہے۔ مرد پر بیوی کے لیے مثل معروف نان ونفقہ کا بندوبست کرنا بھی فرض ہے۔

دفعہ نمبر121: گھر کے کاموں میں میاں بیوی کو مکمل تعاون کرنا چاہیے۔ گھر سے باہر کے تمام کام خاوند کے ذمہ ہیں۔ گھر کے تمام اندرونی کام حسبِ استطاعت عورت کے اوپر ہیں۔ جن کاموں کو کرنے پر بیوی قادر نہ ہو تو ان کے لیے خادم مہیا کرنا خاوند کی ذمہ داری ہے۔

دفعہ نمبر122: چھوٹے بچوں کی پرورش عورت کا فرض بھی ہے اور اس کا حق بھی، خواہ عورت مسلم ہو یا غیر مسلم۔ جب تک بچے کی پرورش کی ضرورت ہے، یہ اس کی ذمہ داری ہے۔ جب بچے کو اس کی ضرورت نہ رہے تو دیکھا جائے گا کہ دودھ پلانے والی اور ولی دونوں مسلمان ہیں یا نہیں۔ اگر دونوں مسلمان ہوں تو چھوٹے بچے کو اختیار دیا جائے گا کہ وہ جس کے ساتھ رہنا چاہے، رہ سکتا ہے۔ چھوٹا بچہ خواہ لڑکی ہو یا لڑکا، اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اگر دودھ پلانے والی اور ولی میں سے کوئی ایک غیر مسلم ہو تو بچے کو اختیار نہیں ہوگا، بلکہ اُسے مسلمان کے حوالے کیا جائے گا۔

اقتصادی نظام

دفعہ نمبر123: اقتصادی پالیسی یہ ہے کہ ضروریات کو پورا کرتے وقت اس بات کو مدنظر رکھا جائے کہ کن اشیاء پر معاشرے کا دارومدار ہے۔ چنانچہ ضروریات کو پورا کرنے کے لیے اس چیز کو بنیاد بنایا جائے گا جس پر معاشرے کا دارومدار ہے۔

دفعہ نمبر124: (اصل) اقتصادی مسئلہ اموال اور منافع کو ریاست کے تمام افراد پر تقسیم کرنا اور عوام کو اس قابل بنانا ہے کہ وہ کوشش کر کے ان اموال سے فائدہ اٹھا سکیں۔

دفعہ نمبر125: تمام افراد کو فرداً فرداً تمام بنیادی ضروریات کو پورا کرنے کی ضمانت دینا لازمی ہے۔ اسی طرح اس بات کی بھی ضمانت دی جائے گی کہ ہر فرد ان ضروریات کو حاصل کر سکے جن کے ذریعے وہ اپنے معیارِ زندگی کو بہتر بنا سکے۔

دفعہ نمبر126: مال صرف اللہ تعالیٰ کی ملکیت ہے، اسی نے بنی نوع انسان کو مال میں اپنا جانشین بنایا ہے اور اسی عام جانشینی کی وجہ سے انسان کو ملکیت کا حق حاصل ہے۔ اللہ تعالیٰ ہی نے فرد کو اس مال پر ملکیت کا اختیار (اجازت) دیا۔ چنانچہ اس اجازت کی وجہ سے انسان بالفعل مال کا مالک بن گیا۔

دفعہ نمبر127: ملکیت کی تین اقسام ہیں۔ انفرادی ملکیت، عوامی ملکیت، ریاستی ملکیت۔

دفعہ نمبر128: انفرادی ملکیت ایک شرعی حکم ہے۔ اس کا تعلق عین (اصل) یا منفعت سے ہے۔ اس ملکیت کا تقاضا ہے کہ صاحبِ مال کو مال سے یا مال کے عوض، فائدہ اٹھانے کا اختیار حاصل ہو۔

دفعہ نمبر129: عوامی ملکیت سے مراد یہ ہے کہ معاشرے کو مشترکہ طور پر عین (اصل) سے فائدہ اٹھانے کی شرعی اجازت ہے۔

دفعہ نمبر130: ہر وہ مال، جسے خرچ کرنا خلیفہ اور اس کے اجتہاد پر موقوف ہے، وہ ریاست کی ملکیت ہے، مثلاً ٹیکس، خراج اور جزیہ سے حاصل ہونے والے اموال۔

دفعہ نمبر131: انفرادی ملکیت، خواہ وہ اموالِ منقولہ ہوں یا غیر منقولہ، وہ ان پانچ شرعی اسباب سے حاصل کی جاسکتی ہے:

(1) عمل (کام)

(2) میراث

(3) جان بچانے کے لیے مال حاصل کرنا

(4) ریاست کی جانب سے اپنے اموال میں سے رعایا کو دینا

(5)وہ اموال، جنہیں افراد کسی مال کے بدلے یا جدوجہد کے بغیر حاصل کریں

دفعہ نمبر132: ملکیت میں تصرف شارع کی اجازت پر موقوف ہے۔ خواہ یہ تصرف مال کو خرچ کرنے سے متعلق ہو یا ملکیت میں اضافہ کرنے کے حوالے سے ہو۔ چنانچہ اسراف، نمود و نمائش، کنجوسی، سرمایہ دارانہ کمپنیاں، کوآپریٹو سوسائٹیز اور تمام خلافِ شرع معاملات ممنوع ہیں۔ اسی طرح سود، غبنِ فاحش، ٹھگی، ذخیرہ اندوزی اور جواء اور اس جیسے دیگر چیزیں سبھی ملکیت کے تصرف کے لیے ممنوع ہیں۔

دفعہ نمبر133: عشری زمین وہ ہے جہاں کے رہنے والے (مالک) اس زمین پر رہتے ہوئے ایمان لائیں، مثلاً جزیرہ عرب کی سرزمین۔ خراجی زمین، عرب کو چھوڑ کر ہر وہ زمین ہے، جو جنگ یا صلح کے ذریعے فتح کی گئی ہو۔ عشری زمین اور اس سے حاصل ہونے والی منفعت دونوں افراد کی ملکیت ہوتے ہیں۔ خراجی زمین ریاست کی ملکیت ہوتی ہے اور اس کا فائدہ افراد کی ملکیت ہوتا ہے۔ شرعی عقود کے تحت ہر فرد کو عشری زمین اور خراجی زمین کی منفعت تبدیل کرنے کا حق حاصل ہے۔ دوسرے اموال کی طرح یہ زمین بطورِ میراث بھی منتقل ہو گی۔

دفعہ نمبر134: بنجر زمین کی آبادکاری اور اس کی حد بندی کے ذریعے اس کا مالک بنا جا سکتا ہے۔ غیر بنجر زمین کی ملکیت صرف شرعی سبب یعنی میراث، خریداری اور کسی کی طرف سے ہبہ کرنے سے ہو گی۔

دفعہ نمبر135: زمین خواہ خراجی ہو یا عشری، اسے کرائے پر دینا ممنوع ہے۔ جس طرح کہ مزارعت (زمین کو ٹھیکے پر دینا) ممنوع ہے۔ البتہ مساقات مطلقاً جائز ہے۔

دفعہ نمبر136: ہر مالکِ زمین کو زمین سے فائدہ اٹھانے پر مجبور کیا جائے گا۔ زمین سے فائدہ اٹھانے کے لیے اسے کسی قسم کی امداد کی ضرورت ہو تو بیت المال سے ہر ممکن طریقے سے اس کی مدد کی جائے گی۔ ہر وہ شخص، جو زمین سے تین سال تک کوئی فائدہ اٹھائے بغیر اسے بیکار چھوڑے رکھے، تو یہ زمین اس سے لے کر کسی اور کو دے دی جائے گی۔

دفعہ نمبر137: تین طرح کی اشیاء عوامی ملکیت میں شامل ہیں:

(1)ہر وہ چیز جو جماعت کی ضرورت ہو، مثلاً شہر کے میدان۔

(2)ختم نہ ہونے والی معدنیات جیسے تیل کے کنوئیں۔

(3)وہ اشیاء جو طبعی طور پر افراد کے ساتھ مخصوص نہیں ہو سکتیں، مثلاً نہریں۔

دفعہ نمبر138: کارخانہ بحثیتِ کارخانہ انفرادی ملکیت ہوتا ہے۔ تاہم کارخانے کا وہی حکم ہے جو اس کی پیداوار کا ہے۔ چنانچہ کارخانے میں پیدا ہونے والی چیز انفرادی املاک میں سے ہو تو کارخانہ بھی انفرادی ملکیت میں ہو گا، مثلاً کپڑے کا کارخانہ۔ اگر کارخانے کی پیداوار ایسی شے ہو جو عوامی ملکیت کے زمرے میں آتی ہو تو کارخانہ بھی عوامی ملکیت ہو گا، جیسا کہ لوہے کا کارخانہ۔

دفعہ نمبر139: ریاست کے لیے یہ جائز نہیں کہ وہ انفرادی ملکیت کی کسی چیز کو عوامی ملکیت میں دے دے۔ کیونکہ عوامی ملکیت ہونا مال کی نوعیت پر منحصر ہے اور یہ مال کی صفت ہے، نہ کہ ریاست کی رائے۔

دفعہ نمبر140: امت کے ہر فرد کو عوامی ملکیت میں داخل ہر چیز سے فائدہ اٹھانے کا حق حاصل ہے۔ ریاست کے لیے کسی خاص فرد کو عوامی ملکیت کے املاک کا مالک بنانا یا صرف اُس شخص کو اس سے فائدہ اٹھانے کی اجازت دینا جائز نہیں۔

دفعہ نمبر141: ریاست کے لیے رعایا کے مفادات کے لیے بنجر زمین یا عوامی ملکیت میں داخل کسی چیز کو (لوگوں کے لیے) ممنوع قرار دینا جائز ہے۔

دفعہ نمبر142: مال کو جمع کر کے خزانہ بنانا ممنوع ہے، اگرچہ اس پر زکوٰۃ بھی کیوں نہ دی جائے۔

دفعہ نمبر143: مسلمانوں سے زکوٰۃ لی جائے گی۔ زکوٰۃ صرف اُن اموال پر لی جائے گی جن پر زکوٰۃ لینے کو شریعت نے متعین کر دیا ہے، مثلاً نقدی، تجارتی ساز وسامان، مویشی اور غلہ۔ جن اموال پر زکوٰۃ لینے کی کوئی شرعی دلیل نہ ہو، اُن پر زکوٰۃ نہیں لی جائے گی۔ زکوٰۃ ہر صاحبِ نصاب سے لی جائے گی، خواہ وہ مکلف ہو جیسا کہ عاقل بالغ انسان یا وہ غیر مکلف ہو، جیسا کہ بچہ اور مجنون۔ پھر اس زکوٰۃ کو بیت المال کی ایک خاص مد میں رکھا جائے گا۔ زکوٰۃ کو قرآن کریم میں وارد آٹھ اصناف میں سے کسی ایک یا ایک سے زائد اصناف کے علاوہ کہیں اور خرچ نہیں کیا جائے گا۔

دفعہ نمبر144: ذمیوں سے جزیہ لیا جائے گا اور جزیہ ذمیوں کے بالغ مردوں سے ان کی استطاعت کے مطابق لیا جائے گا۔ عورتوں اور بچوں سے جزیہ نہیں لیا جائے گا۔

دفعہ نمبر145: خراجی زمین پر خراج استطاعت کے مطابق لیا جائے گا اور عشری زمین کی پیداوار پر زکوٰۃ لی جائے گی۔

دفعہ نمبر146: مسلمانوں سے وہ ٹیکس وصول کیا جاتا ہے جس کی شرع نے اجازت دی ہو اور جتنا بیت المال کے اخراجات کو پورا کرنے کے لیے کافی ہو۔ شرط اس میں یہ ہے کہ یہ ٹیکس اس رقم پر وصول کیا جاتا ہے جو صاحبِ مال کے پاس معروف طریقہ کے مطابق اپنی ضروریات کو پورا کرنے کے بعد زائد ہو اور یہ ٹیکس ریاست کی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے بھی کافی ہو۔

دفعہ نمبر147: وہ تمام اعمال، جن کی انجام دہی کو شریعت نے امت پر فرض قرار دیا ہے، اگر بیت المال میں ان اعمال (ذمہ داریوں) کو انجام دینے کے لیے مال نہ ہو تو یہ فرض امت کی طرف منتقل ہوتا ہے۔ ایسی صورت میں ریاست کو اس امر کا حق حاصل ہے کہ وہ اس فریضہ سے عہدہ برآ ہونے کے لیے امت پر ٹیکس لازم کر دے۔ لیکن جن امور کی ادائیگی کو شریعت نے امت پر فرض قرار نہیں دیا ہے، ان کے لیے ٹیکس وصول کرنا ریاست کے لیے جائز نہیں۔ چنانچہ ریاست کورٹ فیس یا دفتری فیس یا عدالتی ٹیکس یا اس نوعیت کا کوئی بھی ٹیکس نہیں لے سکتی۔

دفعہ نمبر148: ریاستی بجٹ کی اصناف دائمی نوعیت کی ہوتی ہیں، جنہیں احکامِ شرعیہ نے مقرر کر دیا ہے۔ اس کی مزید ذیلی مدات ہوتی ہیں جن میں سے ہر مد کے لیے رقوم مختص کی جاتی ہیں۔ بجٹ کی مقدار اور جن مدات کے لیے رقوم مختص کی جاتی ہیں، یہ سب خلیفہ کی رائے اور اجتہاد پر موقوف ہے۔

دفعہ نمبر149: بیت المال کی آمدن کے دائمی ذرائع یہ ہیں۔ مالِ فے، جزیہ، خراج، رکاز کا پانچواں حصہ اور زکوٰۃ۔ ان اموال کو ہمیشہ وصول کیا جائے گا۔ خواہ ان کی ضرورت ہو یا نہ ہو۔

دفعہ نمبر150: بیت المال کی دائمی آمدنی ریاست کے اخراجات کے لیے ناکافی ہونے کی صورت میں ریاست مسلمانوں سے ضرائب (ٹیکسز) وصول کرے گی اور یہ ٹیکسز ان مدات کے لیے اکٹھے کیے جائیں گے:

(ا) فقراء، مساکین، مسافر اور فریضہ جہاد کی ادائیگی کے لیے اور بیت المال کے ذمے فرض اخراجات کو پورا کرنے کے لیے۔

(ب) اُن اخراجات کو پورا کرنے کے لیے، جنہیں پورا کرنا بیت المال کے ذمہ بطورِ بدل واجب ہے، مثلاً ملازمین کے اخراجات، فوجیوں کا راشن اور حکام کے معاوضے۔

(ج) اُن اخراجات کو پورا کرنا، جو بیت المال پر مفادِ عامہ کے لیے بغیر کسی بدل کے واجب ہیں، مثلاً نئی سڑکیں بنانا، زمین سے پانی نکالنا، مساجد، مدارس اور ہسپتال بنوانا۔

(د) اُن نقصانات کا تدارک کرنا، جو بیت المال پر واجب ہیں، مثلاً کوئی ہنگامی حالت، قحط، طوفان اور زلزلے۔

دفعہ نمبر151: وہ اموال بھی ذرائع آمدن میں شمار ہوتے ہیں جو ریاست کی سرحدوں پر کسٹم کے ذریعے حاصل ہوتے ہیں اور بیت المال میں جمع ہوتے ہیں۔ اس طرح عوامی ملکیت یا ریاستی ملکیت سے حاصل ہونے والے اموال اور وہ اموال جن کا کوئی وارث نہ ہونے کی وجہ سے انہیں بیت المال میں رکھا گیا ہو نیز مرتدین کا مال بھی ذرائع آمدن ہیں۔

دفعہ نمبر152: بیت المال کے اموال کو ان چھ اصناف میں تقسیم کیا جائے گا:

(1) وہ آٹھ اصناف جو اموالِ زکوٰۃ کے مستحق ہیں، اُن پر زکوٰۃ کی مد سے خرچ کیا جائے گا۔

(2) فقراء، مساکین، مسافر (ابنِ سبیل)، جہاد، مقروض (غارمین) پر خرچ کرنے کے لیے اموالِ زکوٰۃ میں سے کچھ مال موجود نہ ہو تو ان پر بیت المال کی دائمی نوعیت کی آمدنی کے ذرائع سے خرچ کیا جائے گا۔ لیکن اس میں بھی اگر کوئی مال نہ ہو تو قرض داروں (غارمین) پر کچھ خرچ نہیں کیا جائے گا۔ لیکن فقراء، مساکین، مسافر اور جہاد کی ضرورت کو پورا کرنے کے لیے ٹیکس لگایا جائے گا اور اگر ٹیکس لگانے میں کسی خرابی کا اندیشہ ہو تو ٹیکس کی بجائے بطورِ قرض اموال حاصل کیے جائیں گے۔

(3) وہ اشخاص جو ریاست کے لیے خدمات سرانجام دے رہے ہیں، جیسے ملازمین، حکام اور فوج، ان پر بیت المال سے خرچ کیا جائے گا۔ لیکن جب بیت المال کا مال اس کے لیے کافی نہ ہو تو ٹیکس لگا کر ان کی ضروریات کو پورا کیا جائے گا اور اگر ٹیکس لگانے کی صورت میں کسی قسم کی خرابی کا خوف ہو تو اس مقصد کے لیے قرض لیے جائیں گے۔

(4) بنیادی مصالح (مفادات) اور ضروریات جیسے راستوں، مساجد، ہسپتالوں اور سکولوں پر بیت المال سے خرچ کیا جائے گا۔ لیکن جب بیت المال میں اتنا مال نہ ہو تو ٹیکس وصول کر کے ان پر خرچ کیا جائے گا۔

(5) اعلیٰ سہولیات اور ضروریات پر بیت المال سے خرچ کیا جائے گا۔ جب بیت المال میں ان پر خرچ کرنے کے لیے مال موجود نہ ہو تو ان پر کچھ خرچ نہیں کیا جائے گا۔ بلکہ انہیں ملتوی کیا جائے گا۔

(6) ہنگامی حالات مثلاً زلزلہ اور طوفان وغیرہ کی صورت میں بیت المال سے خرچ کیا جائے گا۔ بیت المال میں مال نہ ہونے کی صورت میں ان کے لیے فوراً قرض لیا جائے گا۔ پھر ٹیکس جمع کر کے اسے ادا کیا جائے گا۔

دفعہ نمبر153: ریاست اپنے ہر شہری کے لیے روزگار کی ضمانت دے گی۔

دفعہ نمبر154: افراد اور کمپنیوں کے ملازمین تمام فرائض اور حقوق کے لحاظ سے ریاست کے ملازمین کی طرح ہیں۔ جو بھی اُجرت پر کام کرتا ہے وہ ملازم ہے، خواہ عمل اور عامل (کام کرنے والے) کی نوعیت کچھ بھی ہو۔ چنانچہ جب اجیر (ملازم) اور مستاجر (کام کروانے والے) کے درمیان اجرت پر اختلاف ہو جائے تو اجرتِ مثل کے مطابق فیصلہ کیا جائے گا۔ اگر اس (اجرت) کے علاوہ کسی اور چیز میں اختلاف ہو جائے تو اس کا فیصلہ احکامِ شریعت کے مطابق ملازمت کے معاہدے کے تحت ہو گا۔

دفعہ نمبر155: کام کے فائدے یا ملازم سے حاصل ہونے والے نفع کے لحاظ سے اجرت کو مقرر کرنا جائز ہے۔ ملازم کی معلومات یا اس کی علمی شہادت (اسناد) کے لحاظ سے اس کی اجرت مقرر نہیں کی جائے گی۔ ملازم کی تنخواہ میں کوئی سالانہ اضافہ نہیں ہو گا، بلکہ انہیں ان کے کام کی پوری اجرت دی جائے گی، جس کے وہ مستحق ہیں۔

دفعہ نمبر156: جس شخص کے پاس مال نہیں یا وہ کام نہیں کر سکتا اور نہ ہی اس کا کوئی ایسا رشتہ دار ہے جس پر اسے نفقہ دینا فرض ہو تو ریاست اسے نفقہ کی ضمانت دے گی۔ اس طرح عاجز و محتاج کو ٹھکانہ دینا بھی ریاست کی ذمہ داری ہے۔

دفعہ نمبر157: ریاست ایسی تدابیر اختیار کرتی ہے کہ مال رعایا کے درمیان گردش کرتا رہے اور صرف خاص طبقے کے درمیان ہی گردش میں نہ رہے۔

دفعہ نمبر158: ریاست رعایا کے ہر فرد کو اس قابل بنانے کی کوشش کرتی ہے کہ وہ اپنے لیے اعلیٰ معیارِ زندگی کی ضرورتوں کو پورا کر سکے۔ ریاست درجِ ذیل طریقے سے معاشرے میں توازن پیدا کرنے کی کوشش کرتی ہے، اور جس کا انحصار اموال کی دستیابی پر ہے:

(ا) بیت المال میں جو اموال ہوں، خواہ وہ منقولہ ہوں یا غیر منقولہ اور مالِ فے وغیرہ، ریاست ان میں سے رعایا کو عطا کرے گی۔

(ب) جن لوگوں کے پاس اتنی زمین نہ ہو جس سے ان کا گزارہ ہو سکے تو ریاست انہیں آباد زمین میں سے زمین دے گی۔ البتہ جن لوگوں کے پاس زمین تو ہے لیکن وہ اسے کاشت نہیں کرتے تو انہیں زمین نہیں دی جائے گی۔ جو لوگ زراعت نہیں کر سکتے انہیں مال دیا جائے گا۔

(ج) ایسے قرض دار، جو اپنا قرض چکانے سے عاجز ہوں، ریاست زکوٰۃ کے مال اور مالِ فے وغیرہ سے ان کا قرضہ چکائے گی۔

دفعہ نمبر159: ریاست زرعی امور اور زرعی پیداوار کی نگرانی اِس زرعی پالیسی کی ضرورت کی بنیاد پر کرے گی کہ زمین سے اس طرح فائدہ اٹھایا جائے کہ زمین کی پیداوار زیادہ سے زیادہ ہو۔

دفعہ نمبر160: ریاست صنعت سے متعلق تمام امور کی خود نگرانی کرتی ہے اور عوامی ملکیت میں داخل تمام مصنوعات کی دیکھ بھال بھی براہِ راست خود کرتی ہے۔

دفعہ نمبر161: بیرونی تجارت کا اعتبار تاجر کے ملک کے لحاظ سے ہوگا نہ کہ ساز و سامان کے لحاظ سے۔ چنانچہ حربی ملک کے تاجر کا ہمارے علاقوں میں تجارت کرنا ممنوع ہے، سوائے یہ کہ کسی خاص تاجر یا خاص مال کی تجارت کی اجازت دی گئی ہو۔ جن ممالک کے ساتھ ہمارے معاہدات ہیں تو ان کے تاجروں کے ساتھ ہمارے اور ان کے درمیان طے پانے

والے معاہدے کی رو سے معاملہ کیا جائے گا۔ عوام میں سے جو تاجر ہوں گے انہیں اس چیز کو باہر لے جانے سے روکا جائے گا، جس کی ریاست کو ضرورت ہے یا جس سے دشمن کو فوجی، صنعتی یا اقتصادی قوت حاصل ہوتی ہو۔ البتہ انہیں اپنا مال ریاست میں لانے سے نہیں روکا جائے گا۔ ان احکامات سے وہ ملک مستثنیٰ ہوگا جس کے ساتھ ہم عملاً حالتِ جنگ میں ہیں، جیسا کہ اسرائیل، کیونکہ اس کے ساتھ تمام معاملات، خواہ وہ تجارتی ہوں یا کوئی اور اسے دارالحرب فعلاً سمجھتے ہوئے طے کیے جائیں گے۔

دفعہ نمبر162: رعایا کے تمام افراد کو زندگی کے مسائل سے متعلق ریسرچ لیبارٹریاں بنانے کا حق حاصل ہے اور خود ریاست کو بھی چاہیے کہ وہ اس قسم کی تجربہ گاہیں قائم کرے۔

دفعہ نمبر163: افراد کو ایسی تجربہ گاہوں کی ملکیت سے روکا جائے گا، جو ایسا مواد پیدا کریں جس کا افراد کی ملکیت میں ہونا امت یا ریاست کے لیے ضرر رساں ہو۔

دفعہ نمبر164: ریاست رعایا کے تمام افراد کو تمام طبّی سہولتیں مفت مہیا کرے گی، لیکن وہ ڈاکٹروں کو پرائیویٹ پریکٹس کرنے اور ادویات فروخت کرنے سے نہیں روکے گی۔

دفعہ نمبر165: غیر ملکی سرمائے کا استعمال اور غیر ملکی سرمایہ کاری ریاست میں ممنوع ہوگی، اس طرح کسی غیر ملکی کو کوئی امتیازی رعایت نہیں دی جائے گی۔

دفعہ نمبر166: ریاست اپنی ایک خاص کرنسی جاری کرے گی اور اسے کسی اجنبی کرنسی سے منسلک کرنا جائز نہیں ہوگا۔

دفعہ نمبر167: ریاست کی کرنسی سونا اور چاندی پر مشتمل ہوگی، خواہ اسے ڈھالا گیا ہو یا نہ ڈھالا گیا ہو۔ سونا اور چاندی کے علاوہ کسی اور چیز کو نقدی کی حیثیت حاصل نہیں ہوگی۔ ریاست کے لیے سونا اور چاندی کے بدل کے طور پر کوئی اور

چیز جاری کرنا بھی جائز ہوگا۔ بشرطیکہ جو چیز جاری کی جائے اس کے مساوی اتنی مالیت کا سونا یا چاندی ریاست کی ملکیت میں موجود ہو۔ پس ریاست کے لیے جائز ہے کہ وہ پیتل، کانسی یا کاغذی نوٹ وغیرہ پر اپنے نام کا ٹھپہ لگا کر جاری کرے۔ بشرطیکہ اس کے پاس اتنی ہی مالیت کا سونا یا چاندی موجود ہو۔

دفعہ نمبر168: برابری کے اصول پر جس طرح داخلی طور پر نقدی کا تبادلہ جائز ہے، اسی طرح اسلامی ریاست اور دوسری ریاستوں کی کرنسیوں کے مابین تبادلہ بھی جائز ہوگا۔ اور اگر ان دونوں کرنسیوں کی جنس الگ الگ ہو تو اس صورت میں ان کے مابین کمی بیشی بھی جائز ہوگی۔ لیکن شرط یہ ہے کہ یہ معاملہ دست بدست ہو، ادھار کی بنیاد پر ایسا کرنا جائز نہیں۔ جب دونوں کرنسیاں مختلف ہوں تو بغیر کسی قید (شرط) کے کرنسیوں کے شرح تبادلہ میں کمی بیشی ہو سکتی ہے۔ عوام کا ہر فرد اندرونی یا بیرونی کرنسیوں کو خریدنا یا بیچنا چاہے تو اسے اجازت ہوگی۔ اس کے لیے کسی کرنسی کی اجازت لینے کی ضرورت نہیں ہوگی۔

دفعہ نمبر169: بنک کھولنے کی مکمل ممانعت ہوگی اور صرف اسٹیٹ بنک موجود ہوگا۔ کوئی سودی لین دین نہ ہوگا اور اسٹیٹ بنک بیت المال کے محکموں میں سے ایک محکمہ ہوگا اور اسٹیٹ بنک احکام کے مطابق قرضے جاری کرے گا اور مالیاتی اور کرنسی کے معاملات میں سہولیات فراہم کرے گا۔

تعلیمی پالیسی

دفعہ نمبر170: تعلیمی پالیسی کا اسلامی عقیدے کی بنیاد پر استوار ہونا فرض ہے۔ چنانچہ تمام تدریسی مواد اور طریقہ ہائے تدریس کو اس طرح وضع کیا جائے گا کہ تعلیم میں اس بنیاد سے انحراف بالکل نہ ہو۔

دفعہ نمبر171: تعلیمی پالیسی کا مقصد اسلامی عقلیہ اور اسلامی نفسیہ کی تعمیر ہے۔ لہٰذا وہ تمام مواد، جس کی تدریس مقصود ہو، اسی بنیاد پر ہوگا۔

دفعہ نمبر172: تعلیم کا مقصد اسلامی شخصیت پیدا کرنا اور زندگی کے معاملات سے متعلق علوم و معارف سے لیس کرنا ہے۔ چنانچہ طریقۂ تعلیم کو اس طرح بنایا جائے گا کہ اس سے یہ مقصد حاصل ہو، اور ہر وہ طریقہ ممنوع ہوگا جو اس مقصد سے ہٹاتا ہو۔

دفعہ نمبر173: علومِ اسلامیہ اور علومِ عربیہ کے ہفتہ وار پیریڈ مقرر کرنا ضروری ہے۔ اس طرح وقت اور تعداد کے اعتبار سے دوسرے علوم کے لیے بھی پیریڈ مقرر کیے جائیں گے۔

دفعہ نمبر174: تعلیم میں تجرباتی علوم اور ان سے ملحق علوم مثلاً ریاضی اور ثقافتی علوم کے درمیان فرق کو ملحوظ رکھنا ضروری ہے۔ چنانچہ تجرباتی علوم اور اس سے ملحقہ علوم بقدرِ ضرورت پڑھائے جائیں گے۔ مراحلِ تعلیم میں کسی بھی مرحلہ میں ان کی پابندی لازمی نہیں ہونی چاہیے۔ جہاں تک ثقافتی معارف کا تعلق ہے تو انہیں اعلیٰ تعلیم سے متعین تعلیمی پالیسی کے مطابق ابتدائی مراحل میں اس طرح پڑھایا جائے گا کہ یہ اسلامی افکار واحکامات سے متناقض نہ ہوں۔ اعلیٰ تعلیمی مرحلہ کو فقط سائنس کے طور پر پڑھا جائے گا۔ اس میں بھی یہ شرط ہے کہ یہ تعلیمی پالیسی اور تعلیمی مقصد سے ہٹ کر بالکل نہ ہو۔

دفعہ نمبر175: تعلیم کے ہر مرحلہ میں اسلامی ثقافت کی تعلیم لازمی ہے۔ اعلیٰ مرحلہ میں مختلف اسلامی معارف کی فروعات مخصوص کی جائیں گی، جیسا کہ طب، انجینئرنگ، طبیعات وغیرہ کی تفصیلات مخصوص کی جاتی ہیں۔

دفعہ نمبر176: فنون اور صنعت کا ایک پہلو سائنسی ہے، جیسا کہ تجارتی فنون، جہاز رانی، زراعت وغیرہ۔ اس پہلو سے انہیں بغیر کسی قید و شرط کے حاصل کیا جائے گا اور ان کا ایک ثقافتی پہلو بھی ہے، جب یہ کسی خاص نقطۂ نظر سے متاثر ہوں جیسا کہ تصویر، سنگ تراشی وغیرہ۔ چنانچہ اگر یہ فنون اسلامی نقطۂ نظر کے مخالف ہوں تو انہیں حاصل نہیں کیا جائے گا۔

دفعہ نمبر177: منہجِ تعلیم ایک ہی ہوگا اور ریاست کے منہجِ تعلیم کے علاوہ کسی دوسرے منہج کی اجازت نہیں ہوگی۔ پرائیویٹ سکولوں کی اس وقت تک اجازت ہوگی جب تک کہ وہ ریاست کے تعلیمی منہج، اس کی تعلیمی پالیسی اور اس کے مقصد کی بنیاد پر قائم ہوں گے۔ یہ بھی شرط ہوگی کہ ان میں مخلوط تعلیم (لڑکوں اور لڑکیوں کا ایک ساتھ پڑھنا) کی ممانعت ہوگی۔ مرد وزن کا اختلاط، معلمین اور طلبا دونوں کے درمیان ممنوع ہوگا۔ مزید برآں یہ شرط بھی ہوگی کہ تعلیم کسی خاص گروہ، دین یا مذہب یا رنگ و نسل کے ساتھ مخصوص نہ ہو۔

دفعہ نمبر178: وہ تعلیم جو زندگی کے میدان میں ہر انسان مرد یا عورت کے لیے ضروری ہے، فرض ہوگی۔ چنانچہ پہلے دو مرحلوں میں تعلیم لازمی ہوگی اور یہ ریاست کی ذمہ داری ہے کہ وہ مفت تعلیم کا بندوبست کرے۔ اعلیٰ تعلیم بھی ممکن حد تک مفت دینے کی کوشش کی جائے گی۔

دفعہ نمبر179: ریاست سکولوں اور جامعات کے علاوہ بھی لائبریریاں، تجربہ گاہیں اور معارف کے تمام وسائل مہیا کرے گی، تاکہ وہ لوگ، جو مختلف مباحث اور معارف، مثلاً فقہ، اصولِ فقہ، حدیث و تفسیر، طب، انجینئرنگ، کیمیا وغیرہ میں، اسی طرح ایجادات اور دریافتوں میں اپنی بحث و تحقیق کو جاری رکھنا چاہیں تو وہ اسے جاری رکھ سکیں۔ یوں امت کے پاس مجتہدین، موجدین اور اہل ندرت افراد کی ایک کثیر تعداد موجود ہوگی۔

دفعہ نمبر180: تعلیم کے تمام مراحل میں تالیف سے غلط فائدہ اٹھانا ممنوع ہوگا، کوئی بھی شخص خواہ وہ مؤلف ہو یا کوئی اور، جب کوئی کتاب مطبع کرے گا اور اس کو شائع کرے گا تو پھر نشر و اشاعت کے جملہ حقوق محفوظ نہیں رکھ سکے گا۔ البتہ اگر اس کے پاس ایسے افکار ہوں جن کی اب تک نشر و اشاعت نہیں ہوئی تو اس کے لئے جائز ہے کہ وہ لوگوں کو یہ افکار دے کر اس کی اجرت لے، جیسا کہ وہ کسی شخص کو تعلیم دے کر اجرت لیتا ہے۔

خارجہ سیاست

دفعہ نمبر181: سیاست امت کے اندرونی اور بیرونی معاملات کی دیکھ بھال کو کہتے ہیں۔ سیاست اُمت اور ریاست دونوں کی جانب سے ہوتی ہے۔ ریاست براہِ راست معاملات کی نگرانی کرتی ہے اور امت اس (کام) پر ریاست کا محاسبہ کرتی ہے۔

دفعہ نمبر182: کسی فرد، حزب، گروہ یا جماعت کے لیے یہ جائز نہیں کہ اس کے کسی اجنبی ملک کے ساتھ کسی قسم کے تعلقات ہوں۔ دوسرے ممالک کے ساتھ تعلقات صرف ریاست کا کام ہے۔ کیونکہ صرف ریاست کو امت کے امور کی سرپرستی کا حق حاصل ہے۔ امت اور جماعتیں ان خارجی تعلقات کے بارے میں ریاست کا محاسبہ کر سکتی ہیں۔

دفعہ نمبر183: کسی مقصد کا نیک ہونا اس کے ذریعے (وسیلے) کو نیک (جائز) نہیں بناتا (اَلْغَایَۃ لَا تُبَرِّرُ الْوَاسِطَۃ) کیونکہ طریقہ، فکر کے ساتھ مربوط ہے۔ چنانچہ فرض یا مباح تک پہنچنے کے لیے حرام کو ذریعہ نہیں بنایا جا سکتا۔ پس وسیلے کی پالیسی طریقے کی پالیسی سے کبھی بھی متناقض نہیں ہونی چاہیے۔

دفعہ نمبر184: سیاسی چال چلنا خارجی سیاست میں ایک ضروری امر ہے، اس کی قوت کا راز اس امر میں پوشیدہ ہے کہ اعمال (کاموں) کا اعلان کیا جائے اور اہداف (مقاصد) کو خفیہ رکھا جائے۔

دفعہ نمبر185: سیاست کے اہم ترین اسالیب یہ ہیں: ریاستوں کے جرائم کو بے نقاب کرنے کی جرأت، جھوٹی پالیسیوں کے خطرات کو بیان کرنا، خبیث سازشوں کو بے نقاب کرنا اور گمراہ کن شخصیتوں کی حوصلہ شکنی کرنا۔

دفعہ نمبر186: افراد، امتوں اور ریاستوں کے معاملات کی نگہداشت کے دوران اسلامی افکار کی عظمت کو ظاہر کرنا، خارجہ سیاست کا اعلیٰ طریقہ ہے۔

دفعہ نمبر187: امت کا سیاسی قضیہ (موت وحیات کا مسئلہ) یہ ہے کہ اسلام اس امت کی ریاست کی قوت ہے، اور یہ کہ اسلامی احکامات کا بہترین طریقے سے نفاذ کیا جائے اور دنیا کے سامنے اسلامی دعوت کو پیہم طریقے سے پہنچایا جائے۔

دفعہ نمبر188: اسلامی دعوت کو پیش کرنا ہی خارجی سیاست کے لیے محور ومدار کی حیثیت رکھتا ہے۔ اسی بنیاد پر اسلامی ریاست کے تمام دوسری ریاستوں سے تعلقات قائم ہوں گے۔

دفعہ نمبر189: اسلامی ریاست کے دوسری ریاستوں کے ساتھ تعلقات ان چار پہلوؤں پر مشتمل ہوں گے:

(1) عالمِ اسلام میں قائم تمام مملکتیں گویا ایک علاقے (ملک) میں قائم ہیں۔ یہ خارجی تعلقات کے ضمن میں داخل نہیں ہوں گی اور ان کے ساتھ تعلقات کو خارجہ سیاست نہیں سمجھا جائے گا، بلکہ ان سب کو ایک ریاست کی صورت میں اکٹھا کرنے کے لیے کام کرنا فرض ہے۔

(2) وہ ریاستیں جن کے ساتھ ہمارے اقتصادی، تجارتی، ثقافتی یا اچھی ہمسائیگی کے معاہدات ہیں تو ان کے ساتھ معاملات کو معاہدات کے مطابق نپٹایا جائے گا۔ اگر معاہدہ اجازت دیتا ہو تو اس ریاست کے لوگ شناخت کے ساتھ، بغیر پاسپورٹ کے اسلامی ریاست میں داخل ہو سکیں گے۔ لیکن شرط یہ ہو گی کہ وہ بھی ہمارے ساتھ یہ معاملہ کریں گے۔ اس کے ساتھ اقتصادی اور تجارتی تعلقات محدود مدت اور مخصوص اشیاء کی بنیاد پر ہوں گے اور بشرطیکہ اس ریاست کی اشیاء کی اسلامی ریاست کو ضرورت ہو اور یہ کہ انہیں فروخت کی جانے والی اشیاء اُس ریاست کو مضبوط بنانے کا سبب نہ بنیں۔

(3) وہ ممالک، جن کے اور ہمارے درمیان کسی قسم کے معاہدات نہیں ہیں۔ اسی طرح استعماری ممالک، مثلاً برطانیہ، امریکہ، فرانس اور وہ ممالک، جو مسلمان ممالک پر اپنی نظریں جمائے بیٹھے ہیں، جیسا کہ روس، تو ان کے ساتھ حالتِ جنگ کا معاملہ کیا جائے گا۔ ان کے بارے میں مکمل احتیاط برتی جائے گی۔ ان کے

ساتھ کسی قسم کے سفارتی تعلقات قائم کرنا درست نہیں۔ ان ممالک کے عوام ہماری ریاست میں اس وقت داخل ہو سکیں گے اگر ان کے پاس پاسپورٹ ہو، اور ہر فرد کو ہر سفر کے لیے مخصوص اجازت دی گئی ہو۔

(4) جو ممالک ہمارے ساتھ عملاً حالتِ جنگ میں ہیں جیسا کہ اسرائیل تو اس کے ساتھ تمام معاملات کو حالتِ جنگ کی بنیاد پر نپٹایا جائے گا۔ اس کے ساتھ ہمارا معاملہ عملی جنگ کا ہو گا، خواہ اس کے ساتھ عارضی جنگ بندی کا معاہدہ ہو یا نہ ہو، اور اس کے شہری ہمارے ملک میں داخل نہیں ہو سکتے۔

دفعہ نمبر190: فوجی معاہدات اور اس نوعیت کے دیگر معاہدات یا اس سے منسلک دیگر معاہدات مثلاً سیاسی معاہدات، اڈے اور ائر پورٹ وغیرہ کرایہ پر دینے کے معاہدات، سب ممنوع ہوں گے۔ البتہ اچھی ہمسائیگی، اقتصادی، تجارتی، مالیاتی، ثقافتی معاہدات یا عارضی جنگ بندی کے معاہدات کیے جا سکتے ہیں۔

دفعہ نمبر191: ریاست کے لیے ان تمام تنظیموں میں شرکت جائز نہیں ہو گی، جن کی بنیاد اسلامی نہیں یا جو اسلامی احکامات کو چھوڑ کر غیر اسلامی احکامات کی تطبیق کی بنیاد پر قائم ہیں، جیسا کہ بین الاقوامی تنظیم ''اقوامِ متحدہ''، ''عالمی عدالتِ انصاف''، ''عالمی مالیاتی فنڈ''، ''عالمی بنک''، اسی طرح علاقائی تنظیمیں جیسا کہ عرب لیگ وغیرہ۔

اسلام میں اخلاق

اسلام کی یہ تعریف کی گئی ہے کہ یہ وہ دین ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے سیدنا محمد اپر اس لیے نازل فرمایا تاکہ یہ دین انسان کا اپنے خالق، اپنی ذات اور دوسرے انسانوں کے ساتھ تعلقات کو منظم کرے۔ انسان کا اپنے خالق کے ساتھ تعلق عقائد وعبادات پر مشتمل ہے۔ اس کا اپنی ذات کے ساتھ تعلق اخلاق، مطعومات (کھانے پینے کی چیزوں) اور ملبوسات (پہننے کی چیزوں) پر مشتمل ہے اور دوسرے انسانوں کے ساتھ اس کا تعلق معاملات اور عقوبات پر مشتمل ہے۔

اسلام انسان کی تمام مشکلات حل کرتا ہے۔ یہ انسان کو اس نظر سے دیکھتا ہے کہ وہ ایک ایسا کل ہے جس کے اجزاء نہیں کیے جا سکتے۔ اس لیے وہ انسان کی مشکلات ایک ہی طریقہ سے حل کرتا ہے۔ اسلام نے اپنے نظام کو روحانی اساس یعنی عقیدہ پر استوار کیا ہے۔ لہٰذا روحانی پہلو ہی اس کی تہذیب کی بنیاد ہے اور یہی روحانی پہلو اس کی ریاست اور شریعت کی اساس بھی ہے۔

باجودیکہ اسلامی شریعت نے اپنے نظاموں کو بڑی باریک بینی اور تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے، جیسا کہ عبادات، معاملات، عقوبات وغیرہ، لیکن اسلام نے اخلاق کے لیے کوئی تفصیلی نظام مقرر نہیں کیا۔ اخلاق کے احکامات کو صرف اس اعتبار سے بیان کیا ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کے اوامر ونواہی ہیں۔ اس نقطۂ نظر سے اس کی تفصیل بیان نہیں کی کہ اخلاق ایسی چیز ہے جس کی کوئی خاص اہمیت ہے اور یہ دوسرے احکامات سے ممتاز ہے۔ بلکہ احکامات کی تفصیل کے لحاظ سے اس کی تفصیل دوسرے تمام احکامات سے کم ہے۔ نیز فقہ کے اندر اس کے لیے کوئی خاص باب مقرر نہیں کیا گیا۔ چنانچہ شرعی احکامات پر مشتمل فقہی کتابوں میں بابُ الاخلاق کے نام سے کوئی باب مخصوص نہیں اور فقہاء ومجتہدین نے بھی اخلاقی احکام کی بحث اور استنباط پر کوئی خاص توجہ نہیں دی۔

اخلاق کا کسی بھی حالت میں معاشرے کے قیام میں کوئی عمل دخل نہیں۔ کیونکہ معاشرے کی عمارت نظام ہائے حیات پر استوار ہوتی ہے اور افکار اور احساسات ہی معاشرے پر اثرانداز ہوتے ہیں۔ اخلاق کبھی بھی معاشرے کے قیام پر اثرانداز نہیں ہوتے۔ اخلاق کا معاشرے کی ترقی اور اس کے انحطاط پر بھی کوئی اثر نہیں ہوتا۔ بلکہ معاشرے پر اثر انداز ہونے والی چیز وہ عُرفِ عام ہے، جو زندگی کے بارے میں تصورات سے پیدا ہوتی ہے۔ معاشرے کو چلانے والے اخلاق نہیں ہوتے، بلکہ معاشرے کو وہ نظام چلاتے ہیں، جو اس پر نافذ ہوتے ہیں، نیز معاشرے کو وہ افکار و احساسات چلاتے ہیں، جن کے اُس معاشرے کے لوگ حامل ہوتے ہیں۔ چنانچہ اخلاق بھی افکار و احساسات سے پیدا ہوتے ہیں اور یہ معاشرے میں نافذ نظام کا نتیجہ ہوتے ہیں۔

اس لیے معاشرے میں صرف اخلاق کی طرف دعوت دینے کی اجازت نہیں دی جائے گی۔ کیونکہ اخلاق اللہ تعالیٰ کے اوامر کے نتائج ہیں۔ یہ عقیدہ اور اسلام کے ہمہ گیر نفاذ کی طرف دعوت دینے سے خود بخود پیدا ہوتے ہیں۔ اس لیے بھی کہ اخلاق کی طرف دعوت دینا زندگی کے بارے میں اسلامی تصورات کو الٹنا، لوگوں کو معاشرہ اور اس کے اجزاء کی حقیقت سمجھنے سے دور کرنا اور انفرادی فضائل کی دعوت دے کر انہیں مدہوش بنا کر معاشرے کی ترقی کے حقیقی وسائل سے غافل کرنا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ اسلامی دعوت کو ایک اخلاقی دعوت بنانا انتہائی خطرناک بات ہے۔ کیونکہ اس سے یہ وہم پیدا ہوگا کہ اسلامی دعوت بھی ایک طرح کی اخلاقی دعوت ہے۔ یوں اسلام کی فکری صورت بگڑ جائے گی۔ یہ لوگوں کے فہم کے راستے میں حائل ہو جائے گی اور یہ چیز انہیں اس واحد راستے سے ہٹا دے گی جس سے اسلام نافذ ہوتا ہے، یعنی اسلامی ریاست کا قیام۔ اسلامی شریعت نے جب انسان کے اپنی ذات کے ساتھ تعلقات کے مسئلہ کو اخلاقی صفات سے متعلق شرعی احکامات کے ذریعے حل کیا، تو اس حل کو عبادات اور معاملات کی طرح ایک نظام نہیں بنایا، بلکہ اس میں صرف کچھ متعین قیمتوں کے حصول کی رعایت رکھی، جن کا اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے، مثلاً سچائی، امانت، دھوکہ نہ دینا اور

حسد نہ کرنا۔ یہ صفات ایک ہی چیز سے حاصل ہوتی ہیں اور وہ اخلاقی قیمت سے متعلق اللہ تعالیٰ کا حکم ہے، جیسے مکارم اور فضائل۔ پس امانت ایک ایسا خلق ہے، جس کا اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے۔ اس امانت کی ادائیگی کے وقت اس کی اخلاقی قیمت کا لحاظ رکھنا ضروری ہے۔ چنانچہ اس طرح اس کے ذریعے اخلاقی قیمت حاصل ہو جاتی ہے اور اسی کو اخلاق کہا جاتا ہے۔ جہاں تک اعمال سے بطورِ نتائج صفات کے حصول کی بات ہے، جیسا کہ نماز پڑھنے سے پاکدامنی کا پیدا ہونا، یا معاملات کو نمٹاتے وقت ان امور کا خیال کرنا، جن کو ملحوظ رکھنا لازم ہے، جیسے تجارت کے اندر سچائی کا لحاظ رکھنا، تو ان اعمال سے کوئی اخلاقی قیمت حاصل نہیں ہوتی۔ کیونکہ اعمال کی انجام دہی کا مقصود یہ اخلاقی قیمت نہ تھی۔ بلکہ یہ صفات اعمال کے نتیجہ میں حاصل ہو گئیں۔ کہ وہ ان اخلاقی صفات کی رعایت کرے خواہ وہ اللہ کی عبادت کر رہا ہو یا معاملات کو سرانجام دے رہا ہو۔ اس لیے جب مؤمن نماز سے روحانی قیمت کا قصد کرتا ہے اور تجارت سے مادی قیمت کے حصول کا قصد کرتا ہے، عین اسی وقت وہ اخلاقی صفات سے بھی متصف ہوتا ہے۔

شریعت نے ان صفات کو بھی بیان کر دیا ہے، جن سے مُتّصِف ہونے کو اخلاقِ حسنہ کہا جاتا ہے۔ اور وہ صفات بھی بیان کر دی ہیں جو اخلاقِ سَیِّءَہ (برے اخلاق) کے زمرے میں آتی ہیں۔ لہٰذا شریعت نے اخلاقِ حسنہ کو اختیار کرنے کی ترغیب دی ہے اور اخلاق سیئہ سے منع فرمایا ہے۔ شریعت نے سچائی، امانت، خندہ پیشانی، حیا، والدین کے ساتھ نیک سلوک اور صلۂ رحمی کی ترغیب دی ہے۔ اسی طرح اپنے مسلمان بھائی کو کسی مصیبت سے نکالنے اور اس کے لیے وُہی پسند کرنے کی ترغیب دی ہے، جو وہ خود اپنے لیے پسند کرتا ہے۔ شریعت نے اِن باتوں یا ان جیسی دوسری باتوں کی ترغیب اللہ تعالیٰ کے اوامر کی اطاعت ہونے کے ناطے دی ہے۔ اسی طرح جھوٹ، خیانت، حسد، فجور (گناہ کے کام) وغیرہ اس لیے منع ہیں، کیونکہ اللہ نے ان سے بچنے کا حکم دیا ہے۔

اخلاق شریعت ہی کا ایک حصہ ہیں، اللہ تعالیٰ کے اوامر و نواہی ہی کی ایک قسم ہیں اور ایک مسلمان کے اندر یہ اخلاقی صفات لازمی طور پر ہونی چاہئیں۔ تاکہ اسلام پر مکمل عمل ہو سکے اور اللہ تعالیٰ کے اوامر کی تکمیل ہو سکے۔ البتہ

معاشرے کے اندر ان صفات کو اسلامی احساسات اور اسلامی افکار کو پروان چڑھا کر ہی پیدا کیا جا سکتا ہے۔ جب معاشرے میں یہ صفات (اخلاق) ہوں گی تو فرد کے اندر لا محالہ پائی جائیں گی۔ لہٰذا یہ بات واضح ہے کہ اخلاق کی طرف دعوت دے کہ ان صفات کو پیدا نہیں کیا جا سکتا۔ بلکہ معاشرے کے اندر ان صفات کو پیدا کرنے کے لیے اسلامی احساسات اور اسلامی افکار پیدا کرنے ہوں گے۔ البتہ یہ جاننا بھی ضروری ہے کہ اس کام کا آغاز کرنے کے لیے ایک ایسے کتلہ (جماعت) کو تیار کرنے کی ضرورت ہوتی ہے، جو اسلام کو مکمل طور پر نافذ کرنے کے نصب العین پر قائم ہو۔ جس کے افراد جماعت کے اجزاء کی طرح ہوں، نہ کہ محض افراد۔ تاکہ وہ معاشرے میں مکمل اسلام کے داعی اور علمبردار بن سکیں۔ یوں وہ اسلامی احساسات اور اسلامی افکار کو معاشرے میں پروان چڑھائیں گے اور لوگ فوج در فوج اسلام میں داخل ہونے کی وجہ سے فوج در فوج ان صفات (اخلاق) سے بھی متصف ہو جائیں گے۔ یہ بات اچھی طرح سمجھ لینی چاہیے کہ ہمارے اس قول سے واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ اخلاق اللہ تعالیٰ کے اوامر اور اسلام کو نافذ کرنے کے لیے لازم و ملزوم کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس سے ایک مسلمان کے اخلاقِ حسنہ کی صفات سے متصف ہونے کی ضرورت کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے قرآنِ کریم کی کئی سورتوں میں ان صفات کو بیان فرمایا ہے، جن سے متصف ہونا اور ان کو اپنے اندر پیدا کرنے کی کوشش کرنا انسان کے لیے ضروری ہے۔ یہ صفات عقائد، عبادات، معاملات اور اخلاق پر مشتمل ہیں اور ضروری ہے کہ انسان میں یہ چاروں صفات بیک وقت مجموعی طور پر پائی جائیں۔ سورۂ لقمان میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

(وَاِذْقَالَ لُقْمَانُ لِابْنِهٖ وَهُوَ يَعِظُهٗ يَابُنَيَّ لَاتُشْرِكْ بِاللّٰهِ اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ۔ وَوَصَّيْنَاالْاِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ حَمَلَتْهُ اُمُّهٗ وَهْنًاعَلٰى وَهْنٍ وَّفِصَالُهٗ فِيْ عَامَيْنِ اَنِ اشْكُرْلِيْ وَلِوَالِدَيْكَ اِلَيَّ الْمَصِيْرِ۔ وَاِنْ جَاهَدَاكَ عَلٰى اَنْ تُشْرِكَ بِيْ مَالَيْسَلَكَ بِهٖ عِلْمٌ فَلَا تُطِعْهُمَاوَصَاحِبْهُمَا فِي الدُّنْيَا مَعْرُوْفًا وَّاتَّبِعْ سَبِيلَ مَنْ اَنَابَ اِلَيَّ ثُمَّ اِلَيَّ مَرْجِعُكُمْ

فَاُنَبِّءُکُم بِمَاکُنْتُم تَعْمَلُونَ۔ یَابُنَیَّ اِنَّھَا اِنْتَکُ مِثْقَالَ حَبَّۃٍ مِّنْ خَرْدَلٍ فَتَکُنْ فِیْ صَخْرَۃٍ اَوْ فِی السَّمٰوَاتِ اَوْ فِی الْاَرْضِ یَأتِ بِھَااللّٰہُ اِنَّ اللّٰہَ لَطِیفٌ خَبِیْرٌ۔ یَابُنَیَّ اَقِمِ الصَّلَاۃَ وَأمُرْ بِالمَعْرُوفِ وَانْہَ عَنِ المُنْکَرِ وَاصْبِرْ عَلٰی مَااَصَابَکَ اِنَّ ذَالِکَ مِنْ عَزْمِ الاُمُورِ۔ وَلَا تُصَعِّرْ خَدَّکَ لِلنَّاسِ وَلَا تَمْشِ فِیْ الاَرْضِ مَرَحًا اِنَّ اللّٰہَ لَایُحِبُّ کُلَّ مُخْتَالٍ فَخُوْرٍ۔ وَاقْصِدْ فِیْمَشْیِکَ وَاغْضُضْ مِنْ صَوْتِکَ اِنَّ اَنْکَرَ الْاَصْوَاتِ لَصَوْتُ الحَمِیْرِ)

''اور جب لقمان نے اپنے بیٹے کو نصیحت کرتے ہوئے کہا کہ اے بیٹا! (کسی کو) اللہ کا شریک نہ ٹھہرانا، اس میں کوئی شک نہیں کہ شرک بڑے ہی ظلم کی بات ہے۔ اور ہم نے انسان کو اس کے ماں باپ کے حق میں تاکید کی (کہ وہ اپنے ماں باپ کے ساتھ حسنِ سلوک کرے)۔ اس کی ماں نے تھک تھک کر اس کو پیٹ میں اٹھائے رکھا، اور دو برس تک اسے دودھ پلاتی رہی۔ (اس لیے) ہمارا شکر گزار رہ، اور اپنے والدین کا بھی۔ آخر کار ہماری ہی طرف تم سب کو لوٹ کر آنا ہے۔ اگر تیرے ماں باپ تجھے اس بات پر مجبور کریں کہ تو ہمارے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرائے، جس کی تیرے پاس کوئی دلیل نہیں، تو (اس معاملے میں) ان کا کہنا ماننا۔ (مگر ہاں!) دنیا میں ان کے ساتھ سعادت مندی کے ساتھ رہ، اور ان لوگوں کے طریقے پر چل، جو ہر بات میں ہماری طرف رجوع کرتے ہیں اور ہمارا حکم بجالاتے ہیں۔ پھر آخر کار تم سب کو ہماری طرف ہی لوٹ کر آنا ہے۔ پھر میں تمہیں تمہارے اعمال کے متعلق بتادوں گا۔ بیٹا! اگر کوئی چیز رائی کے دانہ کے برابر ہو پھر وہ کسی پتھر یا آسمانوں میں یا زمین میں ہو، تو اس کو بھی اللہ تعالیٰ لاحاضر کرے گا۔ بے شک اللہ تعالیٰ بڑا باریک بین اور باخبر ہے۔ بیٹا! نماز قائم کر اور (لوگوں کو) اچھے کاموں (کے کرنے) کی نصیحت کیا کر اور برے کاموں سے منع کر، اور تجھ پر جیسی پڑے، اس پر صبر کر، بے شک یہ (بڑی) ہمت کا کام ہے۔ اور لوگوں سے بے رخی نہ کر اور زمین پر اِترا کر نہ چل، (کیونکہ) اللہ کسی اِترانے والے شیخی خورے کو پسند نہیں کرتا۔ اور اپنی رفتار میں میانہ روی (اختیار) کر اور اپنی آواز کو نیچا کر، کیونکہ آوازوں میں سب سے بُری آواز گدھے کی ہے۔'' (آیات: 13تا19)

اور سورۃ الفرقان میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

(وَعِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِينَ يَمْشُونَ عَلَى الْاَرْضِ هَوْنًا وَّاِذَاخَاطَبَهُمُ الْجَاهِلُوْنَ قَالُوْاسَلَامًا۔ وَالَّذِينَ يَبِيْتُوْنَ لِرَبِّهِمْ سُجَّدًا وَّقِيَامًا۔ وَالَّذِينَ يَقُولُوْنَ رَبَّنَا اصْرِفْ عَنَّا عَذَابَ جَهَنَّمَ اِنَّهَا عَذَابَهَا كَانَ غَرَامًا۔ اِنَّهَا سَآءَتْ مُسْتَقَرًّا وَّمُقَامًا۔ وَالَّذِيْنَ اِذَاانْفَقُوْا لَمْ يُسْرِفُوْا وَلَمْ يَقْتُرُوْا وَكَانَ بَيْنَذَالِكَ قَوَامًا۔ وَالَّذِيْنَ لَايَدْعُوْنَ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا آخَرَوَلَايَقْتُلُونَ النَّفْسَ الَّتِيْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ وَلَايَزْنُونَ وَمَنْ يَّفْعَلْذَالِكَ يَلْقَ اَثَامًا۔ يُضَاعَفْ لَهُ الْعَذَابُ يَومَ القِيَامَةِ وَيَخْلُد فِيْهٖ مُهَانًا۔ اِلَّا مَنْ تَابَ وَآمَنَ وَعَمِلَ عَمَلاً صَالِحًا فَاُولٰٓئِكَ يُبَدِّلُ اللّٰهُ سَيِّءَا تِهِم حَسَنَاتٍ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُورًارَّحِيمًا۔ وَمَنْ تَابَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَاِنَّهُ يَتُوبُ اِلَى اللّٰهِ مَتَابًا۔ وَالَّذِينَ لايَشْهَدُوْنَ الزُّورَ وَاِذَامَرُّوا بِاللَّغْوِ مَرُّواكِرَامًا۔ وَالَّذِيْنَ اِذَ اذُكِّرُوا بِآيَاتِ رَبِّهِمْ لَمْ يَخِرُّوا عَلَيْهَا صُمًّا وَّعُمْيَانًا۔ وَالَّذِيْنَ يَقُوْلُونَ رَبَّنَا هَبْ لَنَا مِنْ اَزْوَاجِنَا وَذُرِّيّٰتِنَا قُرَّةَ اَعْيُنٍ وَّاجْعَلْنَا لِلْمُتَّقِينَ اِمَامًا۔ اُولٰٓئِكَ يُجْزَوْنَ الغُرْفَةَ بِمَا صَبَرُوا وَيُلَقَّوْنَ فِيْهَا تَحِيَّةً وَّسَلَامًا۔ خٰلِدِينَ فِيْهَا حَسُنَتْ مُسْتَقَرًّا وَّمُقَامًا)

’’رحمن کے (فرمانبردار) بندے تو وہ ہیں جو زمین پر نرمی کے ساتھ چلیں اور جب جاہل ان سے مخاطب ہوں تو (انہیں) سلام کریں (اور الگ ہو جائیں)۔ اور جو راتوں کو اپنے پروردگار کے آگے سجدے اور قیام کریں۔ اور جو دعائیں مانگیں کہ اے ہمارے پروردگار! عذابِ دوزخ کو ہم سے دور ہی رکھیئے، کیونکہ دوزخ کا عذاب (بہت بھاری) مصیبت ہے۔ وہ (تھوڑی دیر) ٹھہرنے اور (ہمیشہ) رہنے کی بری جگہ ہے۔ اور جو خرچ کرنے لگیں تو فضول خرچی نہ کریں اور نہ بہت تنگی کریں، بلکہ ان کا خرچ افراط و تفریط کے درمیان ایک سیدھی گزران ہو۔ اور جو اللہ کے ساتھ (کسی) دوسرے معبود کو نہ پکاریں اور ناحق کسی کو جان سے نہ ماریں کہ اس بات کو اللہ تعالیٰ نے حرام کیا ہے، اور نہ ہی وہ زنا کے مرتکب ہوں۔ اور جو ایسے عمل کرے گا، وہ (اپنے) گناہ کا خمیازہ بھگتے گا۔ قیامت کے دن اسے دوہرا عذاب دیا جائے گا۔ اور وہ ذلیل و رُسوا ہو کر ہمیشہ اسی حال میں رہے گا۔ مگر جس نے توبہ کی اور ایمان لایا اور نیک عمل کیے، تو اللہ ایسے لوگوں کے گناہوں کو نیکیوں سے بدل دے گا۔ اور اللہ بڑا بخشنے والا مہربان ہے۔ اور جو شخص توبہ کرے اور اس کے بعد وہ نیک عمل (بھی) کرے، تو وہ حقیقت میں اللہ کی طرف رجوع کرتا ہے۔ اور (اللہ کے فرمانبردار بندوں میں سے) وہ (بھی) ہیں جو

جھوٹی گواہی نہ دیں اور جو بیہودہ مشغلوں کے پاس سے گزریں تو وضع داری کے ساتھ گزریں۔ اور وہ لوگ کہ جب انہیں ان کے پروردگار کی آیات سناسنا کر نصیحت کی جائے تو وہ اندھے اور بہرے ہو کر ان پر نہ گر پڑیں۔ اور جو دعائیں مانگتے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار! ہمیں ہماری بیویوں (کی طرف) سے اور ہماری اولاد (کی طرف) سے آنکھوں کی ٹھنڈک عنایت فرما اور ہمیں پرہیز گاروں کا پیشوا بنا۔ یہی لوگ ہیں جن کو ان کے صبر کے بدلے (جنت میں رہنے کے لیے) بالاخانے ملیں گے، اور وہاں دعا اور سلام کے ساتھ ان کا استقبال کیا جائے گا۔ (اور یہ لوگ) جنت میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے۔ اور یہ کیا ہی اچھی جگہ ہے، ٹھہرنے کے لیے اور ہمیشہ رہنے کے لیے۔" (آیات 63 تا 76)

اور اللہ تعالیٰ نے سورۃ الاسراء میں ارشاد فرمایا:

(وَقَضٰیرَبُّکَ اَلَّاتَعْبُدُوا اِلَّا اِیَّاہُ وَبِالْوَالِدَیْنِ اِحْسَانًا اِمَّا یَبْلُغَنَّ عِنْدَکَ الْکِبَرَ اَحَدُھُمَا اَوْکِلَاھُمَا فَلا تَقُل لَّھُمَا اُفٍّ وَّلَا تَنْھَرْھُمَا وَقُلْ لَّھُمَا قَوْلاً کَرِیْمًا۔ وَاخْفِضْ لَھُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ مِنَ الرَّحْمَۃِ وَقُل رَّبِّ ارْحَمْھُمَا کَمَارَبَّیٰنِیْ صَغِیْرًا۔ رَبُّکُم اَعْلَمُ بِمَافِیْ نُفُوسِکُمْ اِنْ تَکُوْنُوا صَالِحِیْنَ فَاِنَّہُ کَانَ لِلاَوَّابِیْنَ غَفُورًا۔ وَاٰتِ ذَی الْقُربٰی حَقَّہُ وَالْمِسْکِینَ وَابْنَ السَّبِیْلِ وَلَا تُبَذِّرتَبْذِیْرًا۔ اِنَّ الْمُبَذِّرِیْنَ کَانُوا اِخْوَانَ الشَّیٰطِیْنِ وَکَانَ الشَّیْطَانُ لِرَبِّہٖ کَفُورًا۔ وَاِمَّاتُعْرِضَنَّ عَنْھُمُ ابْتِغَآءَ رَحْمَۃٍ مِّنرَّبِّکَ تَرْجُوھَا فَقُل لَّھُمْ قَولاً مَّیْسُورًا۔ وَلَا تَجْعَلْ یَدَکَمَغْلُولَۃً اِلٰیعُنُقِکَ وَلَا تَبسُطْھَا کُلَّ الْبَسْطِ فَتَقْعُدَ مَلُومًا مَّحسُورًا۔ اِنَّ رَبَّکَ یَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَن یَّشَآءُ وَیَقْدِرُ اِنَّہُ کَانَ بِعِبَادِہٖ خَبِیْرًا بَصِیْرًا۔ وَلَا تَقْتُلُوا اَوْلَادَکُم خَشْیَۃَ اِملَاقٍ نَّحنُ نَرْزُقُھُم وَاِیَّاکُم اِنَّ قَتْلَھُم کَانَ خِطاً کَبِیْرًا۔ وَلَا تَقْرَبُوالزِّنٰی اِنَّہُ کَانَ فَاحِشَۃً وَّسَآءَ سَبِیلاً۔ وَلَا تَقْتُلُوالنَّفْسَ الَّتِی حَرَّمَ اللہُ اِلَّابِالحَقِّ وَمَنْ قُتِلَ مَظْلُومًا فَقَدْجَعَلنَالِوَلِیِّہٖ سُلطَانًا فَلَا یُسرِفْ فِّی الْقَتْلِ اِنَّہُ کَانَ مَنْصُورًا۔ وَلَا تَقْرَبُوا مَالَ الیَتِیمِ اِلَّا بِالَّتِی ھِیَ اَحْسَنُ حَتّٰی یَبْلُغَ اَشُدَّہُ وَاَوْفُوا بِالعَھْدِ اِنَّ العَھْدَ کَانَ مَسْءُولاً۔ وَاَوْفُوالکَیْلَ اِذَا کِلْتُمْ وَزِنُوا بِالقِسْطَاسِ المُسْتَقِیمِذٰالِکَخَیْرٌ وَّاَحسَنُ تَأوِیْلاً۔ وَلَا تَقْفُ مَالَیسَلکَ بِہٖ عِلْمٌ اِنَّ السَّمْعَ وَالبَصَرَ وَالفُؤَادَ کُلُّ اُولٰءِکَکَانَ عَنہُ مَسْءُولاً۔ وَلَا تَمْشِ فِی الاَرْضِ مَرحاًاِنَّکَلَنْ تَخْرِقَ الاَرْضَ وَلَنْ تَبلُغَ الجِبَالَ طُولاً۔ کُلُّ ذَالِکَکَانَ سَیِّءُہُ عِنْدَ رَبِّکَ مَکْرُوْھًا)

''اور تمہارے پروردگار نے حکم دے دیا ہے کہ اس کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو اور والدین کے ساتھ حسنِ سلوک سے پیش آؤ۔ اگر والدین میں ایک یا دونوں تمہارے سامنے بڑھاپے کو پہنچیں تو ان کے سامنے اُف بھی نہ کرنا اور نہ انہیں جِھڑکنا اور ان سے کچھ کہنا ہو تو ادب کے ساتھ کہنا اور محبت سے خاکساری کا پہلو اُن کے آگے جھکائے رکھنا اور ان کے حق میں دعا کرتے رہنا کہ اے میرے پروردگار! جس طرح انہوں نے مجھ چھوٹے سے کو پالا ہے اور میرے حال پر رحم کرتے رہے ہیں، تُو بھی ان کے حال پر رحم فرما۔ تمہارے دل کی بات کو تمہارا پروردگار خوب جانتا ہے۔ اگر تم (حقیقت میں) سعادت مند ہو تو وہ تمہیں معاف کر دے گا کیونکہ وہ توبہ کرنے والوں کی خطاؤں کو بخشنے والا ہے۔ اور رشتہ دار، غریب اور مسافر (ہر ایک) کو اس کا حق پہنچاتے رہو اور دولت کو ناحق مت اڑاؤ۔ کیونکہ دولت کو بے جا اڑانے والے شیاطین کے بھائی ہیں اور شیطان اپنے پروردگار کا بڑا ہی ناشکرا ہے۔ اور اگر تمہیں اپنے پروردگار کے فضل کے انتظار میں، جس کی تمہیں توقع ہو، ان (غرباء) سے منہ پھیرنا پڑے، تو نرمی سے انہیں سمجھا دو۔ اور اپنا ہاتھ نہ تو اتنا سکیڑو کہ (گویا) گردن میں بندھا ہے اور نہ اس کو بالکل پھیلا دو۔ (ایسا کرو گے) تو تم ایسے بیٹھے رہ جاؤ گے کہ لوگ بھی تمہیں ملامت کریں گے اور تم تہی دست بھی ہو گے۔ تمہارا پروردگار جس کی روزی چاہتا ہے، فراخ کر دیتا ہے، اور جس کی روزی چاہتا ہے، نپی تُلی کر دیتا ہے۔ اور وہ اپنے بندوں (کے حال) سے باخبر اور (ان کی ضرورتوں کو) دیکھنے والا ہے۔ اور افلاس کے ڈر سے اپنی اولاد کو قتل نہ کرو۔ انہیں بھی ہم ہی روزی دیتے ہیں اور تمہیں بھی۔ اور اولاد کو جان سے مارنا بڑا بھاری گناہ ہے۔ اور زنا کے پاس بھی نہ پھٹکنا، کیونکہ یہ بے حیائی اور (بہت ہی) بُرا چلن ہے۔ اور کسی کو ناحق قتل کرنا اللہ نے حرام کر دیا ہے، اور جو شخص ظلم سے مارا جائے تو ہم نے اس کے والی (وارث) کو قاتل کا قصاص لینے کا اختیار دیا ہے، تو اسے چاہیے کہ خون (کا بدلہ لینے) میں زیادتی نہ کرے، کیونکہ اس کی مدد کر دی گئی ہے۔ اور یتیم کے مال کے پاس بھی نہ جانا، مگر جس طرح کہ (یتیم کے حق میں) بہتر ہو، جب تک کہ وہ اپنی جوانی کو پہنچ جائے۔ اور عہد کو پورا کیا کرو، کیونکہ (قیامت کے دن) عہد کی بازپرس ہو گی۔ اور جب ماپ کر دو تو پیمانے کو پورا بھر کر دیا کرو اور ڈنڈھی سیدھی رکھ کر تولا کرو۔ (معاملے کا) یہ بہتر (طریقہ) ہے اور (اس کا) انجام بھی اچھا ہے۔ اور جس بات کا تجھ کو علم نہیں اس

کے پیچھے نہ ہو لیا کر، کیونکہ کان، آنکھ اور دل سب سے (قیامت کے دن) پوچھ گچھ ہونی ہے۔ اور زمین میں اکڑ کر نہ چلا کر، کیونکہ اس سے تو زمین کو نہیں پھاڑ سکے گا اور نہ (تن کر چلنے سے) پہاڑوں کی بلندی کو پہنچ سکے گا۔ ان سب باتوں میں جو بری ہیں، سب ہی تمہارے پروردگار کے نزدیک ناپسند ہیں۔" (آیات: 23تا38)

پس ان تینوں سورتوں کی یہ آیات مختلف صفات کا ایک مکمل مجموعہ ہیں۔ ان سے ایک مسلمان کی صورت اُبھر کر سامنے آتی ہے۔ یہ آیات ایک اسلامی شخصیت کو بیان کرتی ہیں جو دوسروں سے ممتاز ہوتی ہے، اور اس دوران اس بات کا لحاظ رہے کہ یہ (صفات) اللہ تعالیٰ کے اوامر و نواہی ہیں۔ خواہ ان میں موجود احکامات کا تعلق عقیدہ سے ہو، یا عبادات سے، معاملات سے ہو یا اخلاق سے۔ چنانچہ اس بات کا بھی لحاظ رہے کہ یہ آیات صرف اخلاقی صفات تک محدود نہیں، بلکہ جس طرح یہ اخلاقیات پر مشتمل ہیں، بالکل اسی طرح یہ عقیدہ، عبادات اور معاملات پر بھی مشتمل ہیں۔ یہ صفات ہی اسلامی شخصیت کی تعمیر کرتی ہیں۔ صرف اخلاق کسی شخص کو کامل اور اس کی شخصیت کو اسلامی نہیں بناتے۔ پھر یہ بھی لازم ہے کہ ان کا مقصد بھی روحانی اساس، یعنی اسلامی عقیدہ پر مبنی ہو۔ ان صفات سے متصف ہونا بھی اسلامی عقیدے کی بنیاد پر ہونا چاہیے۔ اس لیے ایک مسلمان صدق (سچائی) کی صفت سے صرف صدق (سچائی) کی وجہ سے متصف نہیں ہوتا، بلکہ اس لیے اس صفت کو اپنے اندر پیدا کرتا ہے کہ یہ اللہ کا حکم ہے، اگرچہ وہ سچ بولتے ہوئے اس کی اخلاقی قیمت بھی حاصل کرتا ہے۔ پس اخلاقی صفات سے متصف ہونا صرف ان صفات کی وجہ سے نہیں، بلکہ یہ ان کے اوامر اللہ ہونے کی وجہ سے ہے۔

اس لیے لازمی طور پر مسلمانوں کو ان صفات سے متصف ہونا چاہیے۔ اور یہ کہ ان صفات کا التزام اطاعت او رفرمانبرداری کے جذبے سے ہو، کیونکہ ان کا تعلق تقویٰ سے ہے۔ یہ صفات عبادات سے بطورِ نتائج پیدا ہوتی ہیں۔ جیسے:

(اِنَّ الصَّلَاۃَ تَنْھٰی عَنِ الفَحْشَاءِ وَالمُنْکَرِ)

''یقیناً نماز بے حیائی اور بری باتوں سے روکتی ہے''

اس طرح معاملات میں بھی ان کی رعایت رکھنا ضروری ہے:

(اَلدِّینُ المُعَامِلَة)

''دین معاملات کا نام ہے''

یہ اللہ تعالیٰ کے مقرر کیے ہوئے اوامر و نواہی ہیں، اور یہ امر (یعنی اِن کا اللہ کے اوامر و نواہی ہونا) ہی ان صفات کو ایک مسلمان کے اندر راسخ کر دیتا ہے اور ان کو ایک مسلمان کی عادتِ ثانیہ بنا دیتا ہے۔ اس لیے اخلاق باقی نظام ہائے حیات کا حصہ ہیں، اور یہ مستقل صفات ہیں۔ یہ صفات ایک مسلمان کو صالح بنانے کی ضمانت دیتی ہیں۔ کیونکہ اخلاقی صفات سے متصف ہونے کا مطلب ہے کہ اللہ تعالیٰ کے اوامر کو پورا کرنا اور نواہی سے اجتناب کرنا۔ ان سے متصف ہونے کا ہر گز یہ مقصد نہیں کہ ان سے فائدہ یا نقصان حاصل ہوتا ہے۔ اور یہی وہ چیز ہے، جو کسی شخص کو دائمی طور پر اخلاقِ حسنہ سے متصف کر سکتی ہے اور یہی چیز ایک مسلمان کو اسلام کے نفاذ کی راہ میں ثابت قدم کر سکتی ہے اور اس وجہ ہی سے مسلمان منفعت کے ساتھ گردش نہیں کرتا رہے گا۔ کیونکہ مسلمان ان اعمال کی انجام دہی سے منفعت کا قصد نہیں کرتا، بلکہ اس سے تو بچنا چاہیے۔ کیونکہ ان اعمال کی انجام دہی کا مقصد اخلاقی قیمت ہے، نہ کہ مادی یا انسانی یا روحانی قیمت۔ بلکہ ان قیمتوں کا اس دائرے میں عمل دخل نہیں ہونا چاہیے، تاکہ اس طرح اس فریضہ کی ادائیگی اور ان صفات کو اپنانے میں کوئی خلل پیدا نہ ہو سکے۔ اور جس چیز کی طرف تنبیہ نہایت ضروری ہے وہ یہ ہے کہ انسان مادی قیمت کو اخلاق سے دور رکھے اور یہ کہ اِن کی ادائیگی کسی نفع اور فائدے کے لیے بالکل نہ ہو، کیونکہ یہ انتہائی خطرناک بات ہے۔

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ اخلاق معاشرے کو بنانے والی چیز نہیں، بلکہ یہ فرد کی تعمیر کرنے والی چیز ہیں۔ اس لیے معاشرے کی اصلاح کبھی بھی اخلاق کے ذریعے نہیں ہو گی۔ بلکہ معاشرے کی اصلاح صرف اسلامی افکار و احساسات

اور اسلامی نظام ہائے حیات کے نفاذ سے ہو گی۔ فرد کو بھی صرف اخلاق نہیں بناتے، بلکہ اخلاق کے ساتھ عقائد، عبادات اور معاملات بھی لازمی ہیں۔ اس لیے وہ شخص مسلمان نہیں جس کے اخلاق تو بڑے اچھے ہیں لیکن عقائد غیر اسلامی ہیں۔ بلکہ وہ کافر ہے اور کفر سے بڑا گناہ کیا ہو سکتا ہے؟ اسی طرح وہ شخص جس کے اخلاق تو بڑے اچھے ہیں، لیکن عبادات اور معاملات میں وہ شرعی احکامات کا لحاظ نہیں رکھتا، اسے بھی اخلاقِ حسنہ کا حامل نہیں کہہ سکتے، معلوم ہوا کہ ایک فرد کو بنانے کے لیے عقیدہ، عبادات، معاملات اور اخلاق سب لازمی ہیں۔ یہ شرعاً جائز نہیں کہ اخلاق کی طرف خوب توجہ دی جائے اور باقی صفات کو چھوڑ دیا جائے، بلکہ کسی چیز کو نظر انداز کرنا جائز نہیں۔ سب سے قبل جس چیز کے بارے میں اطمینان کر لینا چاہیے، وہ عقیدہ ہے۔ اخلاق کے اندر بھی بنیادی چیز یہ ہے کہ یہ اسلامی عقیدے پر مبنی ہوں، اور مؤمن انہیں اللہ تعالیٰ کے اوامر و نواہی سمجھ کر اپنائے۔